بزمِ اطفال

انتخاب و ترتیب

محمد الیاس انجم

آزاد بک وزن

بزمِ اطفال

انتخاب و ترتیب

محمد الیاس انجم

آزاد بُک ڈپو

ISBN -978-93-83033-09-6

کتاب کا نام	:	بزمِ اطفال
مرتب/مصنف	:	محمد الیاس انجم
سنہ اشاعت	:	2013ء
تعداد	:	500
قیمت	:	395 روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	مسعود احمد، وسیم احمد
ناشر	:	قاسمی کتب خانہ، جموں

Qasmi Kutub Khana
Talab Khatikan, Jamia Masjid, Jammu Tawi-180001
Ph. 9797352280,9419130645
Email: lutfurazad@ymail.com

ملنے کا پتہ

قاسمی کتب خانہ جموں
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
رادھا کرشن آنند جموں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
ایم ایم پبلی کیشن دہلی

AZAD BOOK VISION
EP-316 Moh Dalpatian Jammu
9797352280, 8803600920

انتساب

''اپنے اُن طلباء وطالبات

کے نام

جن سے مجھے

یہ کام کرنے کی

تحریک ملی''

حرفِ آغاز

معروف شاعر ولیم ورڈز ورتھ (William words worth) نے اپنی شہرۂ آفاق نظم دی ریمبو (The Rainbow) میں اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ Child is the father of Manیعنی بچّہ آدمی کا باپ۔ ولیم ورڈز ورتھ کے اس قول کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی چونکہ بچّے ہی وہ پود ہیں جن کی بنیاد پر آگے چل کر انسانیت کا ایک تنآ وردرخت وجود میں آئے گا۔ اگر پود کی صحیح آبیاری نہ کی جائے اس کی تراش خراش میں کوئی کمی رہ جائے تو اس پود سے شجرِ سایہ دار وثمر ادار کی توقع رکھنی بے سود ہے۔

آدمی کی صحیح تربیت اور اس کے اخلاق وعادات کی دُرستی اُسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ ابھی ''بچّہ'' ہی ہو۔ چونکہ بچپن میں اُس کا ذہن سادہ کاغذ کی مانند ہوتا ہے۔ اس پر آپ جو کچھ تحریر کریں گے بچّے کی نفسیات اور کردار پر اُس کے دائمی نقوش مرتب ہوں گے۔ اسی طرح بچّوں کا ادب ایسا ہونا چاہیۓ جو اُن کے

ذوق وشوق اور نفسیات کے عین مطابق ہو۔ اور ساتھ ہی اُن کی سماجی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور سائنسی معلومات میں بھی اضافہ کرے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کے اخلاق و عادات کو سنوارنے کے علاوہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اہم رول ادا کرے تاکہ مستقبل میں وہ ملک کے اچھے اور کامیاب شہری بن سکیں۔

''بزمِ اطفال'' اس سلسلے میں میری پہلی کاوش ہے۔ اس کتاب کو میں نے مذکورہ بالا نکات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا ہے۔ جس میں اُردو کے چند اہم شعراء وادباء کی بچّوں سے متعلق لکھی گئی چند منتخب تخلیقات کے علاوہ اُردو کے مختلف جرائد ورسائل میں شائع شدہ بچّوں کی تربیت سے متعلق مواد کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کو شائع کرتے ہوئے میں کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں چونکہ یہ میرا نہ تو کوئی تحقیقی کارنامہ ہے اور نہ ہی تنقیدی کارکردگی، بلکہ بچّوں کی اصلاح وحوصلہ افزائی کے لئے ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اور میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

میں اپنے والدین، اساتذہ اکرام اور اپنے بڑے بھائی جناب ارشد محمود کا ممنون ہوں کہ جنہوں نے میری تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ میری یہ کتاب دراصل انہی کی دعاؤں، محبتوں اور شفقتوں کا ثمر ہے ورنہ میں کیا ہوں، میری بساط کیا ہے؟ میں احسان مند ہوں اُن دوستوں، عزیزوں اور بچوں کا جن کے خلوص، پیار، ہمدردی اور نیک مشوروں سے یہ کتاب آخری مرحلہ تک پہنچی۔

میرے بہی خواہوں کی فہرست یوں تو بہت طویل ہے مگر جاوید احمد مغل، آفتاب احمد، ڈاکٹر عاشق حسین، ڈاکٹر شیراز بخاری، معظم خان، عمران حسین شاہ، سرفراز، آصف نواز، نازو، شامیہ انساء، زوبیہ تبسم، عادل، ثاقب، محسن اور مدثر احمد

وہ نام ہیں جو اس کتاب کی تیاری کے تمام نشیب وفراز میں میرے ہم راہ رہے۔

قاسمی کتب خانہ کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا اخلاقی فرض ہے چونکہ انہوں نے نہ صرف کتاب کی طباعت واشاعت کی ذمہ داری اٹھائی بلکہ بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ شعاری سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک بھی پہنچایا۔ ••

محمد الیاس انجم

فہرست مضامین

حصّہ نظم

حصہ نثر

کہانیاں

حکائتیں

شخصیات

ایجادوں کی باتیں

بچّوں کے امتحانات اور مسائل

اپنی معلومات بڑھائیں

حصّہ نظم

حمد

حفیظؔ جالندھری

اے دو جہاں کے والی اے گلشنوں کے مالی
ہر چیز سے ہے ظاہر حکمت تری نرالی
تیرے ہی فیض سے ہے سر سبز ڈالی ڈالی
پتّوں میں تیری سبزی پھولوں میں تیری لالی
سارا ہے کام تیرا
پیارا ہے نام تیرا
یہ خاک آگ پانی ہے تیری مہربانی
اونچے پہاڑ چپ ہیں دے کر تیری نشانی
ہے دم قدم سے تیرے دریاؤں میں روانی
ہے فیض عام تیرا
پیارا ہے نام تیرا

ہر شئے میں ہم نے دیکھا تیرے کرم کا سایا
جس جا بھی ہم نے ڈھونڈا تیرا نشان پایا
خالق ہے تو خُدایا مالک ہے تو خُدایا
ہر اک غلام تیرا
پیارا ہے نام تیرا

• • •

نعت

مولانا الطاف حسین حالیؔ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مُرادیں غریبوں کی بھر لانے والا
مُصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے در گزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسِد کو زیرو زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

• • •

بچّے کی دُعا

علّامہ اقبالؒ

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خُدایا میری!
دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے!
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے!

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ! بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

• • •

ترانۂ ہندی

علامہ اقبالؔ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غُربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان ومصر وروما سب مِٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دُشمن دورِ زماں ہمارا

اقبالؔ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

علم حاصل کرو

مہدیؔ پرتاب گڑھی

کہکشاں سے کہ آسماں سے ملے
علم حاصل کرو جہاں سے ملے
مل گئی جس کو علم کی دولت
وہ ہوا ہے جہاں میں باعزت
علم کا ہے بہت بڑا درجہ
کم نظر کب بھلا اِسے سمجھا
علم سے ہی ملا بشر کو وقار
ایک عالم کا دیکھئے کردار
علم تو بانٹنے سے بڑھتا ہے
کم نہیں ہوتا وہ خزانہ ہے
تخت بنتا ہے ، تاج بنتا ہے
علم سے ہی سماج بنتا ہے

ایک بے علم جیسے خالی گلاس
کیا بجھائے گا وہ کسی کی پیاس
آدمی کو بنائے علم انسان
علم ہی سے خدا کی ہو پہچان
علم ہے روشنی سنو بچو
تیرگی دل کی اس سے دُور کرو

●●●

سب کا محافظ

گلزار عالم کٹیہاری

ایک تھا جنگل بہت گھنیرا — ہر سو تھا چڑیوں کا بسیرا
چاروں طرف ہریالی اُس میں — رب کی تھی رکھوالی اُس میں
خوب انوکھا ایک شجر تھا — جس میں رہتی تھی ایک مینا
پیار میں ڈوبی بولی اُس کی — میٹھی میٹھی بولی اُس کی
سب کا دل بہلاتی تھی وہ — سب سے عزت پاتی تھی وہ
جنگل میں ایک سانپ تھا موٹا — نیت کا بد، من کا کھوٹا
سب سے بڑھتی دیکھ کر عزت — کرتا تھا مینا سے نفرت
ایک دن چپکے پیڑ پہ چڑھ کر — حملہ کر بیٹھا مینا پر
صورت جب بچنے کی نہ دیکھی — مینا نے تب رب سے دُعا کی
رب نے اس مظلوم کی سن لی — بدبختی ظالم کی آئی
سانپ زمیں پہ جوں ہی آیا — سامنے ایک نیولے کو پایا
نیولا تھا وہ کس بل والا — چالاکی میں سب سے نرالا

دیکھا سانپ تو جھپٹا فوراً بچ نہ سکا بدبخت کا جیون

تنگ ہو جب دُشمن کا گھیرا رب ہے صرف بچانے والا

جس کو حفاظت میں رب رکھے

کون بھلا پھر اُس کو چکھے

• • •

ہمدردی
(ایک بُلبُل اور جُگنو)

علامہ اقبالؔ

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اُڑنے چُگنے میں دن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگر چہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

•••

ایک پہاڑ اور گلہری

علاّمہ اقبالؔ

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے
ذراسی چیز ہے، اس پر غرور! کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ ، یہ شعور ! کیا کہنا!
خُدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں ، جانور غریب کہاں؟
کہا یہ سُن کے گلہری نے ، منھ سنبھال ذرا
یہ کچّی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا!
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا!
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خُدا کی قدرت ہے

کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان مین تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے
قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ کو
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھا لیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

• • •

ایک مکڑا اور مکھی

علامہ اقبالؔ

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
اس راہ سے ہوتا گذر روز تمہارا!
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھُولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا!
اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا، پھر نہیں اُترا
مکڑے نے کہا: واہ! فریبی مجھے سمجھے
تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا

منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ
کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا

اُڑتی ہوئی آئی ہو خُدا جانے کہاں سے
ٹھیرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں بُرا کیا؟
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا

لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمان کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسّر نہیں ہوتا

مکھی نے کہا: خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں، یہ اُمید نہ رکھنا!
ان نرم بچھونوں سے خُدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا!
مکڑے نے کہا دل میں سُنی جو بات اس کی
پھانسوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی!
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا!
ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت

ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حُسن، یہ پوشاک ، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اُڑایا

• • •

ماں کا خواب

علامہ اقبال

میں سوئی اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرّد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چُپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اُس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جان!
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟

جُدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پرواہ ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ ، اچھی وفا تم نے کی

جو بچّے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رُلاتی ہے تجھ کو جُدائی میری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی میری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چُپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اُسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

• • •

کہنا بڑوں کا مانو

الطاف حسین حالیؔ

ماں باپ اور اُستاد سب ہیں خُدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمہارے نعمت
کڑوی نصیحتوں میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ کا عزیزو، مانا نہ جس نے کہنا
دشوار ہے جہاں میں عزت سے اُس کا رہنا
ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلت کا اسکو سہنا
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

تم کو نہیں خبر کچھ اپنے بُرے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی، اُتنی ہے عقل چھوٹی
ہے بہتری اُسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

• • •

ماں

محمد الیاس انجمؔ

کتنی ٹھنڈی کتنی میٹھی چھاؤں ہے تیرے آنچل کی
یاد آئے تو حالت میری ہوجاتی ہے بیکل سی
بند آنکھیں جب کرتا ہوں تو پاتا ہوں ماں پاس تجھے
روٹھنا میرا ، تیرا منانا سب آتا ہے یاد مجھے
ایک ہاتھ آنکھوں پہ دھر کے دوجے سے سہلاتی تھی
یاد ہے ماں وہ اب تک مجھ کو لوری جو تو سُناتی تھی
جی چاہتا ہے ماں میں پھر سے چھوٹا بچّہ بن جاؤں
تیری اُنگلی پکڑ کے بھاگوں، تیرہاتھ کی روٹی کھاؤں
یہی تمنّا بچپن میں تھی یہی آرزو اب مجھ کو
جو طفلی میں پایا تجھ سے ، وہ ہر حال میں دوں تجھ کو
محنت یا تقدیر کہاں کب جگ میں بڑا بناتی ہے
یہ تو فقط ہے دعا ماں کی جو رنگ اپنا دکھلاتی ہے
دھوپ میں جیسے ٹھنڈا سایہ ماں کی ایسی اُلفت ہے
اسی لئے ماں کے قدموں میں، سب کہتے ہیں جنّت ہے

یاالٰہی! توفیق دے اتنی ماں کی خدمت کر پاؤں
کوئی خطا ہونے سے پہلے اُس غلطی پر شرماؤں
عظمت ماں کی جگ ظاہر ہے اسی لئے انجمؔ کہتا ہے
بخشے گی ہر حال اُسے جو قدموں پہ سر رکھتا ہے

• • •

علم

محمد عباس العزم

ہے یہ دنیا رشکِ جنت علم سے
ملتی ہے انسان کو عظمت علم سے
علم ہی ہتھیار ہے انسان کا
پاتے ہیں سب فتح ونصرت علم سے
ہر بلندی کا ہے بس زینہ یہی
ملتی ہے دُنیا میں رفعت علم سے
ہے حقیقت میں وہی انسان عظیم
مل گئی جس کو عظمت علم سے
آدمی کیاخوب جاتا ہے بدل
جب بدل جاتی ہے قسمت علم سے
ہر طرف پرچم اُسی کا ہے بلند
ہے جہاں میں جاہ وحشمت علم سے
کرتے ہیں سب قدر اہل علم کی
کس قدر ہے شان وشوکت علم سے
ہوتی ہے یہ زندگی جب تلخ تر
لوگ پاتے ہیں حلاوت علم سے

امتحان

قمر سنبھلی

امتحاں، امتحاں، امتحاں، امتحاں
دل پہ جیسے گرے کوئی برقِ تپاں
امتحاں کا تصوّر بھی ہے خوفناک
پھیر دیتا ہے دل کی امیدوں پہ خاک
سلسلہ کس نے جاری کیا یہ عجیب؟
بچے سب رہ گئے اس میں دب کر غریب
کون ہے موجدِ امتحاں کون ہے؟
اس کے پردے میں آخر نہاں کون ہے؟
سن کے لفظِ امتحاں کا چڑھ آیا بخار
دل سے رخصت ہوئے سب کے صبر و قرار
کھائے جاتی ہے فکر امتحاں کی ہمیں
یہ کہاں چین سے جینے دے گی ہمیں

اس نے سارا مزا کِر کِرا کردیا!!
کھیلنا کودنا سب ہی رخصت ہوا

امتحاں کا نہ ہوتا جھمیلا اگر
زندگی اپنی ہوتی مزے سے بسر

کاش پڑتا نہ اس سے ہمیں واسطہ
پاس ہوتے بغیر امتحاں کے سدا

لیکن اس سے مفر بھی نہیں ہے میاں
امتحاں کے بغیر اب گزرے کہاں؟

آگے بڑھنا ہے تو جہدِ پیہم کریں
اس کا ہمت سے خیر مقدم کریں

• • •

آگیا امتحان

ڈاکٹر عزیز اللہ خان عزیزؔ

جم کے محنت کرو رات دن بے گماں
آگیا، امتحاں ، آگیا امتحاں
رکھ دو صندوق میں اب تو شطرنج کو
وقت تھوڑا ہے، آوارگی چھوڑ دو
رکھ دو گیند اور بلا چھپا کر کہیں
وقت برباد کرنا مناسب نہیں
اب کرو خوب جی توڑ محنت میاں
ہو نہ جائے کہیں سال یہ رائیگاں
آگیا امتحاں، آگیا امتحاں

●●●

جو پڑھا ہے رکھو اس پہ گہری نظر
دل لگا کر کرو یاد شام وسحر

پڑھنے سے جو سبق یاد ہوتا نہ ہو
بار بار اُس کو لکھا کرو دوستو!
چھوڑ دو فلم بینی بھی اب تو میاں
آگیا امتحاں، آگیا امتحاں

●●●

ذہن و دل میں رہے یاد اللہ کی
لب پہ بھی ذکر اُس کا رہے ہر گھڑی
اس کو بھولو نہیں اس کو چھوڑو نہیں
اس سے مانگو دُعا اس پہ رکھو یقیں
چھوٹے بچے ہوں بوڑھے ہوں یا ہوں جواں
سب کو رکھ اے خدا! شادماں، کامراں
آگیا امتحاں، آگیا امتحاں

●●●

چاہتے ہو جو بننا بڑا آدمی
قدر سمجھو عزیزو! ذرا وقت کی
ان دنوں میں اگر کھانا کم کھاؤ گے
نیند کم آئے گی جلد اُٹھ جاؤ گے
ہے یہی وقت اب جھیل لو سختیاں
اتنا لکھو کہ دُکھنے لگیں انگلیاں
آگیا امتحاں، آگیا امتحاں

●●●

پرندے کی فریاد

علامہ اقبال

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مُسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی میری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھُٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے!

تاروں بھری رات

حفیظ جالندھریؒ

لو رات آئی
دُنیا پہ چھائی
نیندوں نے آکر ڈالا ہے ڈیرا
آنکھوں میں ایسا کاجل بکھیرا
سارے جہاں میں
چھایا اندھیرا
اکثر گھروں کی ہے روشنی گل
کھیت اور جنگل تاریک بالکل
انسان، حیوان
جان دار، بے جان
چُپ ہو رہے ہیں یا سو رہے ہیں
لو رات آئی دُنیا پہ چھائی

ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار

پھیلے ہوئے ہیں تارے ہی تارے
رہتے ہیں یوں تو خاموش سارے
کرتے ہیں لیکن
باہم اشارے

ندّی کے اندر منہ دیکھتے ہیں
اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں
دریا کی لہریں
پانی کی نہریں

کیا سج رہیں ہیں تاروں بھری ہیں
ہے کیا چمک دار تاروں کا دربار
اے پیارے تارو
شب کے دُلارو

ہاں صبح تک تم چمکے ہی جاؤ
بھٹکے ہوؤں کو رستے دکھاؤ
ہم کو بھی ایسی
خدمت سکھاؤ

نیکی کریں ہم اور نام چمکے
تاروں کی مانند ہر کام چمکے
ہم کو سلیقہ
آ جائے ایسا
دُنیا کو ہم سے آرام پہنچے
اے پیارے تارو شب کے دُلارو

•••

ہندو مسلمان

تلوک چند محرومؔ

ہندو مسلمان ہیں بھائی بھائی
تفریق کیسی، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی یا ہو مسلمان
عزت کے قابل ہے بس وہ انسان
نیکی ہو جس کا کارِ نمایاں
اوروں کی مشکل ہو جس سے آساں
ہر ایک سے نیکی، سب سے بھلائی
ہندو مسلمان سب بھائی بھائی
ہندو مسلمان قومیں پُرانی
دونوں کی دونوں ہندوستانی
دونوں کا مسکن ہندوستاں ہے
دو بُلبلیں ہیں اک گلستاں ہے

اک سر زمیں ہے اک آسماں ہے
دونوں کا یک جا سود و زیاں ہے
نااتفاقی آزارِ جاں ہے
مل جُل کے رہنا ہے کامرانی
ہندو مسلماں قومیں پُرانی

• • •

بڑھے چلو

اُٹھو اُٹھو اُٹھو اُٹھو　　کمر کسو، کمر کسو
سحر سے پہلے چل پڑو　　کڑی ہے راہ دوستو
تھکن کا نام بھی نہ لو
بڑھے چلو، بڑھے چلو
جھجک نہ دل میں لاؤ تم　　بس اب قدم بڑھاؤ تم
ذرا نہ ڈگمگاؤ تم　　خدا سے لو لگاؤ تم
ملول و مضطرب نہ ہو
بڑھے چلو ، بڑھے چلو
اُٹھا دیا قدم اگر　　تو ختم ہے بس اب سفر
ہے راہ صاف و بے خطر　　نہ کوئی خوف ہے نہ ڈر
چلو چلو　　چلو چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو

تمہارے ہم سفر جو تھے وہ منزلوں پہ جا لگے
سب آگے تم سے بڑھ گئے مگر ہو تم پڑے ہوئے
ذرا سمجھ سے کام لو
بڑھے چلو بڑھے چلو
دلوں میں ہے جو ولولہ تو ڈال دو گے زلزلہ
کہ ہے بلند حوصلہ وہ سامنے ہے مرحلہ
وہیں پہنچ کے سانس لو
بڑھے چلو بڑھے چلو

• • •

بچّہ اور جگنو

اسمٰعیل میرٹھیؔ

سناؤں تمہیں بات اک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا یہ سماں
ہوا میں اُڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک بچے کی اُن پر نظر
پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر
چمک دار کیڑا جو بھایا اُسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے
وہ جھم جھم چمکتا ادھر سے اُدھر
پھرا، کوئی رستہ نہ پایا مگر
تو غمگین قیدی نے کی التجا
کہ چھوٹے شکاری مجھے کر رہا
خُدا کے لئے چھوڑ دے چھوڑ دے
مری قید کے جال کو توڑ دے

بچّہ

کروں گا نہ آزاد، اس وقت تک
کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

جُگنو

چمک میری دن میں نہ دیکھو گے تم
اُجالے میں ہوجائے گی وہ تو گُم

بچّہ

ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے
کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اُجالے میں دن کے کُھلے گا یہ حال
کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال
دُھواں ہے، نہ شعلہ، نہ گرمی، نہ آنچ
چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ

جُگنو

یہ قدرت کی کاری گری ہے جناب
کہ ذرّے کو چمکائے جوں آفتاب
مجھے دی ہے اس واسطے یہ چمک
کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹک
نہ الہڑ پنے سے کرو پائمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال!

•••

اردو کا ایک اور قاعدہ

فراق جلال پوری

الف سے اللہ کو تو یاد کر
ب سے بڑھ آگے وفا کی راہ پر
پ سے پڑھ لکھ اور بن جا پیشوا
ت سے تہذیب وطن پر ہو فدا
ٹ سے ٹکرا جا نہ طوفانوں سے ڈر
ث سے ثابت رکھ قدم ہر موڑ پر
ج سے جا مدرسہ مت جھوٹ بول
چ سے چاروں سمت ہے سچ کا ہی مول
ح سے اپنا حوصلہ رکھنا بلند
خ سے خود کو تو بنا مشکل پسند
د سے دل ہوتے ہیں جن کے بڑے
ڈ سے ڈرتے نہیں وہ موت سے

ذ — سے ذمے ترے ہیں نیک کام
ر — سے ایسے روشن کر جہاں میں اپنا نام
ز — سے زندہ دل وہی ہوتے ہیں جو
س — سے سہتے ہیں جو ہر رنج کو
ش — سے شر کا برا انجام ہے
ص — سے صادق کے ہاتھ انعام ہے
ض — سے ضد چھوڑ دے ضدی نہ بن
ط — سے طالب علم بن اے جانِ من
ظ — سے ظالم کے نہ آگے جھک کبھی
ع — سے ہو عہد کا پابند بھی
غ — سے غفلت نہ کر پڑھ لکھ ذرا
ف — سے فوراً کام کر اسکول کا!
ق — سے قربان ہوجا دیس پر
ک — سے انسانیت کا کام کر
گ — سے گندی گناہوں کی ہے راہ
ل — سے لکھ لے لبوں پر لاالہٰ!
م — سے مجبور کو مت تنگ کر
ن — سے نادار کی امداد کر
و — سے رکھ وقت کو دل سے عزیز
ہ — سے ہوتی ہے گراں یہ ایک چیز
ی — سے یہ حرفِ تہجی ہیں تمام
ے — یاد کرنا اب انہیں ہے تیرا کام

حصّہ نثر

کہانیاں

مجھے انصاف چاہیئے

نذیر انبالوی

''میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مجھے انصاف چاہئے۔ مجھے استانی صاحبہ نے جان بوجھ کر فیل کیا ہے۔'' ببلو میاں نے سالانہ امتحان میں ناکام ہونے کے بعد گھر میں شور مچا رکھا تھا۔ سب گھر والے حیران تھے کہ بظاہر بڑی محنت کرنے والا بچہ کیسے فیل ہو گیا؟ ببلو میاں کا کہنا تھا کہ انہوں نے ہر سوال سوچ سمجھ کر حل کیا تھا، پھر نہ جانے کیوں استانی صاحبہ نے انہیں فیل کر دیا؟ ''یہ ظلم اور زیادتی ہے۔ انصاف تو اس زمین سے اُٹھ گیا ہے۔'' اُن کی ایک ہی رٹ تھی۔

''اچھا بھئی میں کل خود تمہارے ساتھ اسکول جاؤں گی۔ اگر تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے تو اس کا ازالہ کیا جائے گا۔'' امی جان نے ببلو میاں کو تسلی دی۔ دوسرے دن وہ اُس کے ساتھ پرنسپل صاحبہ کے کمرے میں موجود تھیں۔

''اچھا تو آپ ببلو میاں کے پرچے دیکھنا چاہتی ہیں۔'' پرنسپل صاحبہ نے کہا۔

''ایسا ہو جائے تو نوازش ہوگی۔'' وہ بولیں۔

''میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مجھے انصاف چاہئے۔'' ببلو میاں منمنائے۔
امّی جان نے گھورا تو وہ خاموش ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد ببلو میاں کے حل شدہ پرچے پرنسپل صاحبہ کی میز پر تھے۔

''یہ پرچے دیکھ لیجئے۔'' پرنسپل صاحبہ نے پرچے امی جان کی طرف بڑھائے۔ پہلے حساب کا پرچہ تھا جس کا پہلا سوال یہ تھا۔ ایک آدمی نے ایک بکرا پچاس روپے میں فروخت کیا تو اُسے بارہ فیصد فائدہ ہوا۔ اگر وہ یہ بکرا نوے روپے میں فروخت کرتا تو اُسے کتنا نفع ہوتا؟

ببلو میاں نے یہ سوال اس طرح حل کیا۔ مجھے پرچہ بنانے والے کی عقل پر رونا آرہا ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں پچاس روپے کا بکرا کہاں ملتا ہے؟ اتنے روپیوں میں تو مرغا بھی نہیں ملتا؟ یہ سوال ہی سراسر غلط ہے میں اسے کس طرح حل کر سکتا ہوں؟

دوسرا سوال تھا: اگر سجاد اپنے دوست تسلیم کو تین ہزار روپئے چار فیصد سالانہ سود پر قرض دے تو چار سالوں میں اُسے کتنا سود ملے گا؟

ببلو میاں لکھتے ہیں۔ توبہ توبہ، مسلمان ہو کر ایک دوسرے سے سود وصول کرتے ہیں۔ سود لینا اور دینا اسلام میں حرام ہے۔ میں ایسا سوال ہرگز حل نہیں کروں گا۔

تیسرا سوال اس طرح تھا: ایک عمارت تیس مزدور دس دنوں میں تعمیر کرتے ہیں تو یہی عمارت پچاس مزدور کتنے دنوں میں مکمل کریں گے؟

ببلو میاں نے جواب میں لکھا: پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی عمارت دس دنوں کے اندر تعمیر نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر مزدور کے پاس الٰہ دین کا چراغ ہو تو ایسا ممکن ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سوال میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ مزدور سرکاری ہیں یا

نجی۔ اگر یہ مزدور سرکاری ہیں تو یہ عمارت دس سالوں میں بھی مکمل نہیں ہوگی جب کہ نجی مزدوروں کی صورت میں یہ عمارت قبل از وقت تعمیر ہونے کا امکان ہے۔

ببلو میاں کی امی جان کو یہ جوابات پڑھ کر بڑا غصہ آیا۔ انہیں ایک بار پھر ہلکی سی آواز سنادی۔ ''میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، مجھے انصاف چاہئے۔''

اب اُردو کا پرچہ امی جان کے سامنے تھا۔ پہلا سوال مضمون کا تھا۔ کرکٹ میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیجئے۔

ببلو میاں نے لکھا۔ رات سے بارش ہو رہی ہے اس لئے میچ نہیں ہو سکا، جونہی میچ شروع ہوا میں اُس کا آنکھوں دیکھا حال لکھوں گا۔ دوسرا سوال خط لکھنے کا تھا۔ اپنے ابا جان کو خط لکھئے کہ سردی کا موسم شروع ہونے والا ہے اور آپ گرم کپڑے خریدنا چاہتے ہیں لہٰذا دو سو روپے منی آرڈر کر دیں۔

ببلو میاں نے لکھا۔ گرم کپڑوں کے دو سو روپئے بہت زیادہ ہیں۔ سنڈے بازار سے تیس سے پچاس روپئے میں گرم کپڑے مل سکتے ہیں۔ میں پچھلے سال گرم کپڑے خرید چکا ہوں۔ اس لئے گرم کپڑوں کیلئے اپنے ابّو سے دو سو روپئے بذریہ منی آرڈر نہیں منگوا سکتا۔

تیسرا سوال تھا۔ پیاسا کوّا کہانی لکھیئے۔

ببلو میاں نے کہانی لکھنے کے بجائے یہ جواب لکھا۔ یہ کہانی بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اب کوّے بھلا کہاں پیاسے رہتے ہیں؟ انہیں جگہ جگہ وافر مقدار میں پانی مل جاتا ہے۔ یہ کہانی اُس زمانے کی ہے جب کارپوریشن کے پانی کے نل گھروں میں نہیں لگے تھے، اب ہر گھر میں سرکاری نل ہے پھر آپ خود فیصلہ کریں کہ کوّا پیاسا کس طرح رہ سکتا ہے؟

چوتھا سوال تھا۔ درج ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجئے۔

ا۔ کلنک کا ٹیکا۔ ۲۔ آنکھیں چرانا۔ ۳۔ باغ باغ ہونا۔ ۴۔ تن بدن میں آگ

لگنا۔ ببلو میاں کے جملے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ کلنک کا ٹیکا۔ جب ڈاکٹر صاحب ہمارے محلے میں کلنک کا ٹیکا لگانے کے لئے آئے تو میں اسکول گیا ہوا تھا۔

۲۔ آنکھیں چرانا۔ طفیل کو آئی بینک (آنکھوں کا بینک) سے آنکھیں چرانے کے جرم میں تین سال کی سزا سنائی گئی۔

۳۔ باغ باغ ہونا۔ کارپوریشن کی محنت سے یہاں ہر طرف باغ ہی باغ ہو گئے ہیں۔

۴۔ تن بدن میں آگ لگنا۔ دیا سلائی دکھاتے ہی آصف کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جملے پڑھنے کے بعد امی جان نے غصیلے انداز میں ببلو میاں کو گھورا۔ اس سے قبل کہ وہ کہتے اُن کے ساتھ ظلم ہوا ہے، امی جان نے اُنہیں ڈانٹا۔ ''تم نے شور مچا کر گھر سر پر اُٹھا رکھا تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ کیا پرچے اس طرح حل کرتے ہیں؟''

''بیگم صاحبہ آپ ببلو میاں کے باقی پرچے بھی ایک نظر دیکھ لیں۔''

''پرنسپل صاحبہ بس اتنے ہی کافی ہیں۔ ببلو میاں چلو، اب گھر چل کر تمہاری خبر لیتی ہوں۔''

امی جان کے حکم پر ببلو میاں کھڑے ہوئے مگر پرنسپل صاحبہ کے کمرے سے نکلتے ہوئے چلائے۔ ''میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، مجھے انصاف چاہئے۔''

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ببلو میاں کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

بشکریہ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور فروری ۲۰۰۴ء

●●●

سزا

پرویز اشرفی

فہد اور اسد دو دوست تھے۔ فہد نہایت شریف اور نیک لڑکا تھا لیکن اسد بہت ہی شریر اور نٹ کھٹ۔ اس کے باوجود دونوں دوست تھے اور ایک ساتھ اسکول پڑھنے جاتے۔ اسد کی شرارت کا حال یہ تھا کہ وہ ہر بے زبان جانور کو تنگ کرتا تھا۔ راستے میں پڑے ہوئے کُتّے پر چھڑی مار دیتا، تو کبھی پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے نکال لاتا۔ میدان میں چر رہی بکریوں کی دم کھینچتا۔ اتنا اودہم مچاتا کہ محلے کی مرغیاں ڈر کے مارے اُڑ اُڑ کر اِدھر اُدھر بھٹک جاتیں۔ فہد کو یہ سب بالکل پسند نہ تھا۔ وہ اسد کو سمجھاتا کہ بے زبان جانوروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے۔ جانوروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا چاہئے کیوں کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور ہمارے یعنی انسانوں کے فائدے کیلئے اس نے بنائے ہیں۔ مگر اسد پر جیسے کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

اس کی گلی میں ایک کُتّا رہتا تھا۔ محلے کے آنے جانے والوں کو وہ پہچانتا تھا اس لئے انہیں وہ کچھ نہیں کہتا لیکن اگر کوئی باہری شخص یا انجانا آدمی گلی سے گزرتا تو

وہ پوری طاقت سے بھونکنا شروع کر دیتا۔ اس کُتّے کی وجہ سے اس محلے میں کبھی چوری کی واردات نہیں ہوئی۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ کُتا گلی کے نکڑ پر جاڑے کے موسم میں دھوپ کا مزہ لینے کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ فہد اور اسد دونوں اسکول جا رہے تھے اچانک اسد کی دماغ میں شیطان نے اپنا اثر دکھایا اور اسد نے یکایک آرام کرتے ہوئے کُتّے کے پچھلے حصے پر زور کی لات ماری کُتا اپنے اوپر ہوئے اس اچانک حملے سے حیران رہ گیا اور تکلیف سے کراہتے ہوئے وہاں سے بھاگ کر دور کونے میں دُم سمیٹ کر دبک کر بیٹھ گیا۔ فہد نے اس حرکت پر اپنی ناراضگی جتائی لیکن اسد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد فہد نے اپنے گھر سے دودھ اور روٹی ایک پیالے میں لے کر کُتّے کے پاس آیا اور چمکارتے ہوئے۔ دودھ و روٹی کا پیالا کُتّے کی طرف بڑھا دیا۔ کُتا کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دم ہلانے لگا اور دودھ روٹی کھا کر زبان سے اپنا منھ صاف کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اب فہد کا روز کا معمول ہو گیا اسکول سے لوٹ کر وہ کُتّے کو دودھ روٹی ضرور دیتا۔ اسد، فہد کی اس ہمدردی پر اس کا مزاق اڑاتا لیکن فہد پر بھی اس کی بات کا کوئی اثر نہ تھا۔

رمضان المبارک کا آخری ہفتہ تھا۔ عید الفطر کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ بچّوں میں مسرت کا ماحول تھا۔ مسرت کے ساتھ ایک مشکل بھی تھی۔ اساتذہ نے چھٹی کے دنوں کے لئے بہت سارا گھر کا کام کرنے کو دیا تھا۔ چھٹیاں شروع ہونے سے قبل فہد نے نظام العمل بنایا جس کے تحت ہر ایک مضمون کے کام کو کس دن کرنا ہے۔ طے کر لیا۔ دوسری طرف اسد نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا وہ چھٹیوں کو صرف تفریح میں گزارنا چاہتا تھا۔ لاکھ سمجھانے پر بھی وہ فہد کی بات نہ مانا بلکہ الٹے یہ کہہ کر فہد کو خاموش کر دیا کہ ”دیکھنا میں بغیر ہوم ورک کیے اسکول جاؤں گا اور اساتذہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔“

فہد کھیلنے کے وقت کھیلتا اور پڑھنے کے وقت پڑھتا لیکن اسد صرف کھیل اور تفریح میں ہی مشغول رہتا آخر کا عید الفطر کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ اور اسکول میں پڑھائی شروع ہو گئی۔ استاد نے درجہ کے تمام بچوں کو ہوم ورک کی کاپی ٹیبل پر رکھنے کا حکم دیا۔ سب ہی بچوں نے حکم کی تعمیل کی حیرت کی بات یہ تھی کہ اسد نے بھی ہوورک کی کاپی رکھ دی۔ جب اسد کی کاپی جانچ کے لئے استاد نے کھولی تو جگہ جگہ صفحات پر پانی پھیلا ہوا تھا۔

جس سے صفحات کئی جگہ پھٹ گئے تھے حروف کی لکھاوٹ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ استاد نے اس کی وجہ پوچھی تو اسد نے جواب میں کہا کہ اسکول آتے وقت ٹھوکر لگنے سے وہ گر گیا تھا اور اس کی کاپی ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر لگے پانی کے نل کے قریب جا گری جس سے وہ گیلی ہو گئی ہو گئے۔ استاد اسد کی باتوں کو سن کر خاموش رہا لیکن تمام کاپیوں کی جانچ کرنے کے بعد سختی سے باز پرس کی تو اسد نے سچائی بیان کر دی اسکول کی چھٹی ہوتے ہی اسد نے اپنا بیگ اٹھایا اور تیزی سے کلاس سے نکل گیا ساتھیوں کی آواز سن کر وہ اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ فہد بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن تب تک اسد اسکول کے گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

وہ بھاگتا جا رہا تھا کہ راستے میں کتوں کا ایک جھنڈ آپس میں لڑ جھگڑ رہا تھا اسد اسی کے برابر سے بھاگا پھر کیا تھا۔ کُتے لڑائی چھوڑ اسد کے پیچھے بھونکتے ہوئے لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسد کی ٹانگوں میں اپنے دانت گڑا دیئے وہ درد کے مارے چیخنے لگا۔ بچاؤ...... بچاؤ...... بچاؤ...... وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہوش آنے پر اس نے خود کو ایک اسپتال میں بستر پر پڑا ہوا پایا۔ اور چاروں طرف اس کے والد، والدہ بھائی بہن تھے اور دوست فہد بھی کھڑا تھا۔ تبھی استاد بھی عیادت کو آ گئے اسد کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔ ”سر مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بہت بُرا

ہوں۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا اور بے زبان جانوروں کو بے قصور مارتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آج اس کی سزا مجھے دے دی۔ نہیں اسد آپ بہت اچھے ہیں کیونکہ آپ نے اپنی غلطی کا احساس کرلیا ہے، استاد نے تسلی دی۔

اب میں کبھی بھی کسی بے زبان کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ صحت مند ہو جانے کے بعد اسد میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ بھی فہد کے ساتھ روزانہ اس کُتے کو دودھ روٹی دینے جاتا اور کُتا اسد کے آگے پیار سے دم ہلاتا رہتا۔

•••

بندر کا کلیجا

شیو کمار

ایک ندی کے کنارے، ایک بڑے سے پیڑ پر ایک بندر رہتا تھا۔ پیڑ میں پورے سال خوب بڑے بڑے اور رسیلے پھل لگتے تھے۔ بندر انہیں بھر پیٹ کھاتا اور موج کرتا۔ وہ اکیلا تھا لیکن خوش تھا۔

ایک دن ایک مگر مچھ تیرتا ہوا ندی کے کنارے آیا۔ بندر نے اس سے پوچھا ''تم کون ہو بھائی اور کہاں سے آرہے ہو؟''

مگر مچھ نے کہا ''میں مگر مچھ ہوں۔ بڑی دور سے آیا ہوں۔ کھانے کی تلاش میں یوں ہی گھومتا رہتا ہوں''۔

بندر نے کہا ''یہاں پر کھانے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس پیڑ پر ڈھیروں پھل ہوتے ہیں۔ چکھ کر دیکھو۔ اچھے لگیں تو اور دوں گا۔ جتنا جی چاہے کھاؤ۔'' یہ کہہ کر بندر نے کچھ پھل توڑ کر مگر مچھ کی طرف پھینک دیئے۔ مگر مچھ نے انہیں چکھ کر کہا ''واہ، یہ تو بڑے مزے دار پھل ہیں۔''

بندر نے اور بہت سے پھل گرا دیئے۔ مگر مچھ انہیں بھی چٹ کر گیا اور بولا

''کل پھر آؤں گا۔ پھل کھلاؤ گے نا؟''

بندر نے کہا'' کیوں نہیں؟ روزانہ آؤ اور جتنا جی چاہے کھاؤ'' مگر مچھ اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن مگر مچھ پھر آیا۔ اس نے شکم سیر ہو کر پھل کھائے اور بندر کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ بندر اکیلا تھا۔ ایک دوست پا کر بہت خوش ہوا۔

اب تو مگر مچھ روز آنے لگا۔ دونوں پیٹ بھر پھل کھاتے اور بڑی دیر تک بات چیت کرتے رہتے۔

ایک دن یوں ہی باتوں باتوں میں بندر نے کہا'' مگر مچھ بھائی میں تو دنیا میں اکیلا ہوں۔'' مگر مچھ نے کہا'' بندر بھائی، میں تو اکیلا نہیں ہوں۔ گھر میں میری بیوی ہے۔ ندی کے اس کنارے ہمارا گھر ہے۔''

بندر نے کہا'' تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں بھابھی کے لئے بھی پھل بھیجتا۔'' جب مگر مچھ جانے لگا تو بندر نے اس کی بیوی کے لئے بہت سے پھل دیئے۔ مگر مچھ کی بیوی کو یہ رسیلے پھل بہت پسند آئے۔ اس نے مگر مچھ سے کہا کہ میرے لئے تم روز اسی طرح پھل لایا کرو۔

بندر اور مگر مچھ میں گہری دوستی ہوگئی۔ مگر مچھ روزانہ بندر سے ملنے کے لئے جاتا۔ جی بھر کر پھل کھاتا اور اپنی بیوی کے لئے بھی لے جاتا۔ مگر مچھ کی بیوی کو پھل کھانا تو اچھا لگتا تھا لیکن بندر کے ساتھ مگر مچھ کی دوستی پسند نہیں تھی۔

ایک دن اُس نے کہا،'' بھلا مگر مچھ اور بندر میں بھی کہیں دوستی ہوتی ہے؟ مگر مچھ تو بندر کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ تم ضرور جھوٹ بولتے ہو؟''

مگر مچھ نے کہا،'' میں سچ بولتا ہوں ۔ یہ بندر بہت اچھا ہے ۔ بے چارہ روزانہ تمہارے لئے اتنے سارے پھل بھیجتا ہے۔ بندر میرا دوست نہ ہوتا تو میں یہ پھل کہاں سے لاتا؟ میں خود تو پیڑ پر چڑھ نہیں سکتا۔''

مگر مچھ کی بیوی نے سوچا ''اگر وہ بندر روز روز اتنے میٹھے پھل کھاتا ہے تو اس کا گوشت کتنا میٹھا ہوگا۔''

یہ سوچ کر اس نے مگر مچھ سے کہا ''ایک دن تم اپنے دوست کو اپنے گھر دعوت دے دو۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' مگر مچھ نے کہا، ''وہ تو زمین پر رہنے والا جانور ہے۔ پانی میں کیسے چل کر آئے گا؟''

اس کی بیوی نے کہا، ''تم اس کی دعوت تو دو۔ بندر چالاک ہوتے ہیں۔ وہ یہاں آنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لے گا۔''

مگر مچھ بندر کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی روز اس سے پوچھتی کہ بندر کب آئے گا۔ مگر مچھ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

مگر مچھ کی بیوی نے سوچا کہ ایسے کام نہیں چلے گا۔ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ ایک دن اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ مگر مچھ سے بولی ''میں بہت بیمار ہوں۔ جب تک بندر کا کلیجا نہیں کھاؤں گی میری بیماری اچھی نہیں ہوگی۔''

''بندر کا کلیجا؟'' مگر مچھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ مگر مچھ کی بیوی نے کراہتے ہوئے کہا ''ہاں...... بندر کا کلیجا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں بچ جاؤں تو اپنے بندر دوست کا کلیجا لا کر مجھ کو کھلاؤ۔''

مگر مچھ نے غمگین ہو کر کہا ''یہ بھلا میں کیسے کر سکتا ہوں؟ میرا وہی تو ایک دوست ہے۔ اس کا برا میں کیسے کر سکتا ہوں؟'' اس کی بیوی نے کہا ''اچھی بات ہے۔ اگر تم کو تمہارا دوست زیادہ پیارا ہے تو اسی کے پاس جا کر رہو۔ تم تو چاہتے ہی ہو کہ میں مر جاؤں۔''

مگر مچھ بڑی الجھن میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ بندر کا کلیجا لاتا تو اس کا پیارا دوست مارا جاتا۔ نہیں لاتا تو اس کی بیوی مر جاتی۔ وہ رونے لگا اور بولا ''میرا ایک ہی تو دوست ہے۔ اس کی جان میں کیسے لے سکتا

ہوں؟''

اس کی بیوی نے کہا، ''تو کیا ہوا؟ تم ٹھہرے مگر مچھ۔'' مگر مچھ تو جانداروں کو مارتے ہی ہیں۔''

مگر مچھ اور بھی زیادہ آنسو بہانے لگا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ بندر کے پاس گیا۔ بندر مگر مچھ کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا، ''کیوں میرے دوست آج اتنی دیر کیسے ہوگئی؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

مگر مچھ نے کہا، ''میرا اور میری بیوی کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تم کو اپنے ساتھ لیتا آؤں۔ اگر تم نہیں چلو گے تو وہ مجھ سے پھر جھگڑا کرے گی؟''

بندر نے ہنس کر کہا، ''بس اتنی سی بات تھی؟ میں بھابھی سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں پانی میں کیسے چلوں گا؟ میں تو ڈوب جاؤں گا؟''

مگر مچھ نے کہا، ''اس کی فکر مت کرو۔ میں تم کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے جاؤں گا۔''

بندر راضی ہو گیا۔ وہ پیڑ سے اترا اور اچھل کر مگر مچھ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

ندی کے بیچ میں پہنچ کر مگر مچھ آگے جانے کے بجائے پانی میں نیچے اترنے لگا۔ بندر ڈر گیا اور بولا، ''کیا کر رہے ہو بھائی؟ اور نیچے اُترے تو میں ڈوب جاؤں گا۔''

مگر مچھ نے کہا ''میں اور نیچے اُتروں گا۔ میں تم کو مارنے کے لئے ہی لایا ہوں۔''

یہ سن کر بندر بہت حیران ہوا۔ اس نے پوچھا، ''کیوں بھائی؟ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

مگر مچھ نے کہا، ”میری بیوی بیمار ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے۔ اس کو بندر کا کلیجا نہیں کھلایا گیا تو وہ مر جائے گی۔ یہاں اور کوئی بندر نہیں ہے۔ میں تم کو مار کر تمہارا کلیجا اپنی بیوی کو کھلاؤں گا۔“

بندر جان گیا کہ اب صرف چالاکی سے ہی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا، ”میرے دوست، یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں تو بھابھی جان کو بچانے کے لئے خوشی خوشی اپنا کلیجا دے دوں گا۔

لیکن وہ تو ندی کے کنارے پیڑ پر رکھا ہے۔ میں اسے وہیں رکھتا ہوں۔ اس وقت تو میں اس کو اپنے ساتھ لانا بھول گیا۔ تم نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو میں لے آتا؟“

مگر مچھ نے کہا، ”چلو واپس چلیں۔ پیڑ پر سے فوراً اپنا کلیجا لے آنا۔ دیر ہو گئی تو میری بیوی کی بیماری بڑھ جائے گی۔“

مگر مچھ لوٹ پڑا اور بڑی تیزی سے تیر کر ندی کے کنارے پیڑ کے پاس پہنچ گیا۔ کنارے پہنچ کر بندر کود کر پیڑ پر چڑھ گیا اور ہنس کر مگر مچھ سے بولا، ”اے بے وقوفوں کے راجا، جاؤ اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ اپنی بیوی سے جا کر کہنا کہ تم دنیا کے سب سے بڑے بیوقوف ہو۔ بھلا کہیں کوئی اپنا کلیجا نکال کر الگ رکھ سکتا ہے؟“

●●●

دھوپ چھاؤں

یوسف دانش

شکیل اور فراز دو گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک ہی اسکول میں ہفتم میں پڑھتے تھے۔ شکیل اور فراز کے گھر والے بھی دونوں کو یکساں پیار کرتے۔ اسکول سے آتے ہی دونوں میدان چلے جاتے اور گھنٹوں کرکٹ کا مزہ لیتے۔ کھیل کے دوران اگر کوئی فراز کو کچھ کہہ دیتا تو شکیل کو بہت غصہ آجاتا اور مارنے مرنے پر تل جاتا۔ یہی حال فراز کا تھا لیکن طریقہ جدا تھا۔ وہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں، بلکہ پیار سے آپس میں سلجھاؤ کر لیتا۔ فراز ایک لائق لڑکا تھا۔ پڑھائی میں بھرپور توجہ دیتا۔ کلاس میں ہمیشہ اول پوزیشن لاتا۔ اس کے برعکس شکیل میں یہ سب خوبیاں دور کی بات، کوئی اچھائی تھی ہی نہیں۔

فراز اسے برابر سمجھاتا کہ تو بھی پڑھائی میں اپنا دل لگا لیکن اس کے دماغ میں ہر وقت صرف کرکٹ کا بھوت سوار رہتا۔ اس کے دو ہی کام تھے کرکٹ میچ دیکھنا جس کی جانکاری دوستوں سے شیئر کرتا اور آٹھوں پہر انڈین ٹیم کی بہتر کارکردگی کے لئے رب سے دعائیں مانگتا۔

فراز کے ابو پولیس آفیسر تھے۔ پچھلے دنوں ہی ان کا تبادلہ کولکاتا میں ہوا تھا۔ پھر یہیں پر سکونت اختیار کی، فراز پڑھنے لگا اور شکیل سے دوستی ہوگئی۔ فراز کی فیملی میں صرف اکیلا فراز اور اس کے والدین تھے۔ جبکہ شکیل کے پریوار میں تین بڑے بھائیوں کے علاوہ دو جوان بہنیں تھیں۔ سب بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی لیکن وہ غریب تھے۔ ابو کی پان کی دکان تھی۔

ششماہی امتحان شروع ہو گیا تھا۔ فراز مطمئن تھا۔ اس کی مکمل تیاریاں جو تھیں۔ جبکہ شکیل دائیں بائیں جھانک رہا تھا۔ اتفاق سے حساب کے ٹیچر وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے اسے کتاب کھولتے ہوئے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سائنس کا پیپر سر نے اس سے چھین لیا۔ لاکھ اس نے منت سماجت کی لیکن بے سود رہا۔ سر نے اس کے سامنے پیپر کو پھاڑ دیا۔ امتحان ختم ہوا۔ نتیجہ برآمد ہوا۔ شکیل کو ناکامی کا ہار ملا۔ فراز فرسٹ رینک لایا۔

ایک روز فراز نے شکیل سے کہا۔ شکیل ! میرے بھائی!! تم میرے اچھے دوست ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم پڑھائی دل لگا کر نہیں کرتے۔ تم بھی میری طرح دل لگا کر پڑھو ورنہ لوگ مجھے بھی تمہاری طرح سمجھنے لگیں گے۔

شکیل نے برجستہ کہا۔ فراز تمہیں مجھ سے دوستی کرنی ہے یا میری پڑھائی سے، میں پڑھوں نہ پڑھوں تم سے مطلب؟ میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں جو اتنی ساری موٹی موٹی کتابوں کو فضول دماغ میں بھروں۔ تمہیں اپنا سر خراب کرنا ہے سو کرو۔ میں تو بس ہائی اسکول تک پڑھوں گا اور پھر زندگی کے حسین خواب کی تکمیل .... لیکن ہاں سنو! تب تک تم پڑھتے پڑھتے اپنے سر کے بال اور منھ کے دانت گرنے مت دینا۔ ورنہ میرے بچے تمہیں چاچا کے بجائے دادا جی کہنا شروع کر دیں گے۔

فراز کا دل دکھی اور اسے اس کی سمجھ پر افسوس بھی ہوا۔ خیر اس نے خاموشی

اختیار کر لی۔ سالانہ امتحان میں شکیل کسی طرح کامیاب ہو گیا۔ آٹھویں میں آ گیا لیکن تعلیم سے کچھ بھی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں لمبی لمبی ترانیاں مارتا۔ بوڑھے باپ کو کوستا کہ آپ نے دولت کیوں نہیں کمائی۔ دیکھئے گا میں آپ لوگوں سے زیادہ ہی نہیں بہت زیادہ پیسہ کماؤں گا۔

ابو یہ سن کر مسکراتے اور کہتے نادان تو ابھی سے کمانے کی باتیں کرتا ہے پہلے اپنی تعلم تو مکمل کر لے۔ شکیل اپنے شانے کو اچکا کر کہتا۔ "ابو تعلیم کی کسے پرواہ ہے؟ مجھے تو صرف نوٹوں سے مطلب ہے۔" ابو نے کہا سماج میں عزت پانے کے لئے پیسوں کے ساتھ ڈگریاں بھی ضروری ہیں۔ "ابو سماج سے میرا لینا دینا نہیں، لیکن ہاں نوٹوں سے بڑی بڑی ڈگریاں ہی نہیں خریدی جاسکتیں بلکہ قابل لوگ بھی خریدے جاسکتے ہیں" ابو یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ ہمیشہ چھوٹا منہ بڑی باتیں کرتا۔ بھائیوں نے اکثر سمجھایا کہ کوئی ہنر سیکھ لو۔ پڑھنا نہ پڑھنا تمہاری مرضی، لیکن یہ ہر بار ٹال جاتا۔

اب نہم میں آچکا تھا۔ اگلے سال ہائی اسکول کا امتحان تھا لیکن اسے ذرہ برابر بھی فکر نہ تھی۔ فراز پوری لگن سے تیاری میں جٹا تھا۔ دو مرتبہ اسکالرشپ بھی پا چکا تھا۔ ادھر شکیل ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ میں دیوانہ تھا۔ کچھ وقت ملتا تو آوارہ دوستوں میں گزار دیتا۔ پڑھائی سے اس کا دل بے زار ہو گیا تھا۔ بھائیوں کا قیمتی لباس، جوتا، گھڑی اور بیلٹ لگا کر محلے میں اپنی جھوٹی شان دکھاتا۔ کبھی کبھی تو شادی کی کسی تقریب میں جانے کے لئے دوستوں سے نئے جوڑے مانگ کر پہن لیتا۔ اپنے بھائی تو کچھ نہیں کہتے جبکہ دوست اپنی چیزوں میں حرف آنے پر بے غیرت کو دوٹوک سنا دیتے۔ وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ اتفاقاً اس کی دونوں بہنوں کے لئے اچھا رشتہ آ گیا۔ دونوں ایک ہی گھر کے لڑکے تھے۔ خوشحال تھے۔ گورنمنٹ سروس تھی۔ ابو نے رشتہ قبول کر لیا لیکن پیسوں کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں نے مدد کی لیکن وہ بھی بال بچے دار تھے۔ بحالت مجبوری ابو نے

اپنی دکان فروخت کردی۔ان روپیوں سے بیٹیوں کی شادیاں کردیں۔شکیل کی ماں جو دمہ کی مریض تھی ۔ سردی کی ایک رات دواؤں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور مریضہ ہمیشہ کیلئے سوگئی۔ابو اور اہل خانہ اب تک خوش تھے لیکن اب غم سے چور چور ہوگئے۔ان دنوں شکیل کا سنٹ اپ تھا۔ماں کی موت سے سکتے میں رہ گیا۔

تیاری تو ویسے بھی نہیں تھی۔ بس یوں ہی امتحان دے دیا۔نتیجہ پہلے سے معلوم تھا۔ناکامی حاصل ہوئی۔اسے اب پڑھائی سے دور ہونے کا راستہ مل گیا۔ فراز کو شاندار کامیابی ملی۔ وہ جی جان سے بورڈ کی تیاری میں لگ گیا۔اب نہ تو فراز کی فرصت تھی۔شکیل سے ملنے کی، نہ ہی شکیل کو.........فراز کے ابو نے شکیل کو اپنی نظروں سے گرادیا اور اپنے بیٹے کو بھی اس سے ملنے کو سختی سے منع کردیا۔ شکیل بھی معاشی زندگی میں اُلجھ کر رہ گیا۔ایک علاقے میں رہ کر بھی دونوں اجنبی ہوگئے۔ وقت کا پرندہ بہت تیزی سے اڑتا گیا۔پتا نہیں چلا کب دن کے بعد شام ڈھلی، کب شب ہوئی اور پھر سحر ہوگئی۔اس واقعے کو پندرہ سال بیت گئے۔اب فراز کی سنئے، اس نے ہائی اسکول میں ریاست گیر سطح پر ٹاپ کیا تھا۔حکومت سے کئی اسکالر شپ ملے۔ حکومت نے اس کی پڑھائی کا ذمہ اٹھالیا۔اس کے ابو کا یوپی پھر سے ٹرانسفر ہوگیا۔وہ وہیں تعلیم حاصل کرنے لگا۔

ایک خوبصورت ہنڈسم نوجوان اعلیٰ قسم کے لباس زیب تن کئے ہوئے اپنی خوبرو بیوی اور ایک بچے کے ساتھ ہوڑہ اسٹیشن کے باہر ٹیکسی ڈھونڈ رہا ہے۔ جہاں ٹیکسیوں کا انبار لگا ہوتا تھا۔آج وہ جگہ خالی خالی ہے۔ایک آٹو چالک جو کافی دیر سے ان تینوں کو پریشان دیکھ رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اور سامنے آکر بولا۔ ’’صاحب آپ کو کہاں جانا ہے؟ چلئے ہم چھوڑ دیتے ہیں‘‘۔اس نوجوان نے کہا ’’نہیں بھائی! ہم کو کافی دور جانا ہے‘‘۔ ’’یہاں ٹیکسی نظر کیوں نہیں آرہی؟‘‘ نوجوان نے دریافت کیا۔آٹو چالک نے کہا ’’ صاحب! آج ٹیکسی

یونین کی ہڑتال ہے۔ وہ بھاڑا بڑھانے کی خاطر .... وہ کچھ اور کہتا کہ نوجوان نے کہا ''ٹمیا برج کونسی بس جائے گی؟''

''صاحب وہ مینی بس جارہی ہے'' شکریہ! نوجوان نے کہا۔

پھر تینوں مینی بس میں سوار ہوگئے۔ اپنے بازو میں بیوی کو بٹھایا اور گود میں بچے کو لیکر بیٹھ گیا اور کہیں گم ہوگیا۔ نہ جانے اسے کس کی یاد ستانے لگی۔ بس اپنی پوری رفتار سے رواں رواں تھی۔ مسافر اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔ تب ہی ایک ہاکر بس میں چڑھا اور اپنی زبان میں ٹافی بیچنے لگا۔ اس نوجوان کے بچے نے ٹافی لینے کے لئے اپنے پاپا کو پریشان کیا۔ ''پاپا! ہمیں بھی متائی (میٹھائی) لے دو۔'' بیٹا! یہ میٹھائیاں اچھی نہیں ہوتیں۔

بچہ رونے لگا۔ تب ہی اس نوجوان نے پیچھے مڑ کر اس لوجینس والے کو آواز دی۔ لوجینس والے...... وہ مڑا...... تم...... ش...... شکیل...... احمد...... فراز......۔

دونوں ایک دوسرے کا حیرانی سے منھ دیکھنے لگے۔ پھر وہ قریب آیا۔ فراز نے اسے گلے سے لگالیا۔ ''ارے شکیل کیا حالت کر رکھی ہے تو نے اپنی؟'' ...... فراز نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، مت پوچھئے فراز بابو............ شکیل نے مشکل سے جملہ پورا کیا۔ ''تجھے یہ کیا ہوگیا؟'' دوست کو کئی القاب سے پکارتا ہے؟ فراز نے ناراض ہوتے ہوئے کہا ''لیکن آپ القاب کے حقدار ہیں'' شکیل نے کہا۔ پھر فراز نے اس سے اس کی ساری داستان سنی۔ شکیل نے کہنا شروع کیا۔ بہن کی شادی کے فوراً بعد امی چل بسی۔ ابو ٹوٹ گئے۔ دوسرے سال ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ بھائیوں نے کہا گھر میں رہنا ہے تو خوراکی دینی ہوگی۔ کمانا تو چاہا لیکن غلط دوستوں نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ ''تو؟'' فراز نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

شکیل نے کہا ''اور کیا، گھر چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ تھوڑے بہت کام کئے۔ ایک حادثے میں میری ایک آنکھ چلی گئی ایک بار ایک

آدمی سے تکرار ہوگئی اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زور کا گھونسا میرے منھ پر مارا جس سے میرے سامنے کے دو دانت جاتے رہے۔ پھر وہ رونے لگا اس کی ہچکی بندھ گئی۔ بس کے مسافر بھی ہکا بکا تھے۔ ''لیکن تو نے شادی نہیں کی؟'' فراز۔ نے سوال داغا؟ معاف کیجئے فراز بابو میں آپ کا مذاق اڑاتا تھا، تعلیم کا میں نے مذاق اڑایا تھا۔ اس لئے تو کچھ بھی پا نہ سکا۔ صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں کیسے؟ فراز نے کہا ''میں ایک ماہر امراض چشم ہوں۔ الحمد اللہ! اس نے زور سے کہا۔ ''یہاں تھوڑی چھٹی گزارنے آیا ہوں'' ویسے آپ آنکھ کے ڈاکٹر بالکل ٹھیک بنے ہیں۔ ہمیشہ آپ روشنی کی بات کرتے تھے۔ اور روشنی سے آپ کو بہت پیار تھا۔ وہ سب چھوڑو چلو میرے ساتھ یوپی مرے یہاں، میں تمہاری آنکھ کا علاج بھی کردوں گا اور تمہاری زندگی پھر سے پٹڑی پر لوٹ آئیگی۔ فراز نے اسے سمجھایا۔ نہیں فراز بابو میں نے روشنی کو ترک کر کے تاریکی اوڑھ لی تھی جس کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ آپ کو اللہ اور اُجالا دے تا کہ ساری زندگی روشنی ہی روشنی بانٹتے پھریں۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ٹافیوں سے بھرے بویام (جار) میں ڈالا اور آٹھ دس لوجینس نکال کر اس کے بیٹے کو دیا۔ ''چلتا ہوں فراز بابو'' ....

فراز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا!!! کیا تم میری بات نہیں سنو گے؟'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''فراز بابو اس نامراد کو کب تک روکئے گا۔ پہلے کب سنی اس نے آپ کی انمول باتوں کو، جواب پندرہ سال بعد سنے گا؟ شکر ہے اس پروردگار کا کہ آج ایک عظیم شخصیت نے اس ذلیل کو پہچان کر ایک لمحے کے لئے ہی سہی اپنا تو لیا۔ ''ہماری سچی کہانی اپنے لڑکے کو ضرور سنانا'' یہ کہتے ہوئے وہ چلتی ہوئی بس سے وہی جملے بھیگی پلکوں اور لرزتے ہونٹوں سے دہراتا ہوا دھواں کی طرح فضا میں گم ہو گیا............

●●●

احسان باعث نجات

مولانا محمد مطیع اللہ نازش

احسان کا عوض احسان ہے۔ احسان یعنی نیکی کرنا، اچھا سلوک کرنا، بھلائی وغیرہ۔ مقولہ ہے کہ نیکی کا بدلہ نیک ملتا ہے۔ کبھی نیکی کے بدلے جان بھی بچ جاتی ہے۔ مزید نیکی کی وجہ سے مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔

وہ اللہ کے برگزیدہ نبیوں میں سے ایک نبی اور رسول ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے بیٹے اور حضرت مریم علیہ السلام کے لڑکے ہیں۔ جن پر انجیل نازل ہوئی تھی۔ انجیل چار آسمانی کتابوں میں سے ایک ہے۔ ان کے ماننے والوں کو عیسائی کہا جاتا ہے۔ جب قرآن کریم نازل ہوا تو انجیل کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر ہیں اور زندہ ہیں۔ قیامت آنے سے پہلے وہ زمین پر آئیں گے اور قرآن کے احکامات پر عمل و تبلیغ کریں گے۔

بیرون کے قریب ایک گاؤں میں ایک دھوبی رہا کرتا تھا۔ یہ دھوبی اس قدر

ظالم اور بے ایمان تھا کہ گاؤں کے تمام لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے۔ جس سے کپڑے دھونے کے لئے لے جاتا تو بس آدھا ہی واپس کرتا اور وہ بھی اچھی طرح پہن کر۔ اگر کوئی اس سے کپڑے طلب کرتا تو اس سے جھگڑے فساد کرتا۔ ہمیشہ چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنا میل جول رکھتا۔ اگر کوئی ذرا سختی سے کپڑوں کا معاوضہ طلب کرتا تو وہ اپنے غنڈوں کے ذریعے اس کی پٹائی کراتا اور اس کا گھر بار تباہ و برباد کر دیتا۔ خدا کے نام پر کچھ دینے سے اسے قدر نفرت تھی کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسکین یا محتاج اس کے دروازے پر آ جاتا، تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیتا۔ جب لوگ اس سے بہت تنگ آ گئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سب لوگ اکٹھا ہو کر گئے۔ انہیں یہ سارا قصہ سنایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے ہمراہ اُس دھوبی کے مکان پر گئے۔ دھوبی کو بہت سمجھایا بجھایا اور بات بات پر خدا کے عذاب سے ڈرایا۔ مگر مرغی کی وہی ایک ٹانگ، کہنے لگا حضرت......! آپ اور آپ کا خدا میرا جو بھی بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں میں اِن حرکتوں سے باز نہیں آؤں گا۔ جب وہ کسی طرح سیدھے راستے پر نہ آیا تو آپ نے باہر آ کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور اُس کے حق میں موت کی دعا مانگی۔

فرشتے سے خبر ملی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بد دعا اُس کے حق میں قبول کر لی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا: اے خدا کے بندوں..........! میری بد دعا منظور ہو گئی۔ کل شام کو اس دھوبی کے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنی شروع ہو جائیں گی۔ اور یہ خدا کے حکم سے کتے کی موت مرے گا۔

دھوبی کو بھی یہ حال معلوم ہو گیا تھا۔ دوسرے دن وہ گھاٹ پر کپڑے دھونے گیا۔ پانی میں اتر کر کپڑے دھونے لگا۔ دوپہر کے قریب اس کی بیوی اس کے لئے کھانا لائی۔

اتنے میں ایک فقیر نہایت خستہ حال کئی روز کا بھوکا اُدھر آنکلا۔ اُس کی زبان خشک ہوکر باہر کو نکلی پڑ رہی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ صرف ایک پھٹے پرانے کپڑے سے اپنے ستر کو چھپائے ہوئے تھا۔ تمام عمر صرف پہلی دفعہ اس دھوبی کو ایک خستہ حال مسکین پر رحم آیا۔ کپڑے کو گھاٹ پر رکھ کر وہ پانی سے باہر آیا۔ فقیر جو لڑکھڑاتا ہوا ایک درخت کے سائے میں چت لیٹ گیا اور ہانپنے کانپنے لگا۔ اس کے قریب جا کر نہایت نرمی سے پوچھا............

کیوں بابا.......... تمہیں بھوک لگی ہے......؟ کھانا کھاؤ گے؟

فقیر کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں شبنم کے قطروں کی طرح آنسو ڈھلکنے لگے۔ ہلکی اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا...... ہاں بابا...... میں کئی دن سے بھوکا ہوں۔

دھوبی کو اُس پر رحم آ گیا، دھوبی نے وہ روٹی کا توشہ دان اس کے سامنے لاکر رکھا اور دستر خوان اس فقیر کے سامنے بچھا دیا۔ اس میں چار روٹیاں اور سالن تھا، فقیر ابھی کچھ پس و پیش میں تھا کہ دھوبی نے کہا ”بھائی جھجکتے کیوں ہو، پیٹ بھر کر کھاؤ۔

فقیر نے کہا: آپ بھوکے رہ جائیں گے۔

دھوبی نے کہا آپ کھالیں، آپ کا بچا ہوا میں کھالوں گا۔

”دھوبی نے کہا زیادہ اصرار نہ کرو، تمہاری جان لبوں پر آئی ہوئی ہے۔ اپنی جان پر رحم کرو، میں شام کو گھر جا کر کھالوں گا۔

فقیر بھوکا تو تھا ہی چاروں روٹیاں ہضم کر گیا۔ دھوبی نے دہی کا پیالہ بھر کر اُسے دیا۔ دہی پی کر شاد ہوکر فقیر کے حواس کچھ ٹھکانے ہوئے۔ دھوبی کے حق میں یہ دعا کی ”خدایا جس طرح اِس شخص نے میری جان بچائی ہے، اسی طرح اِس کی آئی ہوئی بلا کو دور کر،“ یہ کہہ کر فقیر وہاں سے چل دیا۔ دھوبی کو اس فقیر کی بات

کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

دھوبی نے شام کے وقت کپڑوں کی گٹھریاں باندھی اور بیل پر لاد کر گھر کا راستہ ناپا۔ ابھی اس نے گھر کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ اِدھر اُدھر سے لوگ اس کے مکان کے قریب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کو کامل یقین تھا کہ نبی اور رسول کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ لگے آپس میں کانا پھوسی کرنے۔ کوئی کہتا بس اب کوئی دم کی کسر ہے۔ کوئی کہتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بد دعا خالی نہیں جا سکتی۔ دیکھو......! ابھی اس مغرور کو اپنے غرور اور ظلم و ستم لوگوں پر ڈھانے کا انجام نظر آ جائے گا۔

جب کافی رات گزر گئی اور دھوبی کے گھر سے کوئی رونے دھونے کی آواز نہ آئی۔ تو اکثر لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشینگوئی پر شبہ ہونے لگا۔ جوں توں کر کے سب نے رات گزار دی، صبح ہوتے ہی سب لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس گئے اور بد دعا کے نتیجے سے آگاہ کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بڑی تشویش ہوئی، آخر فرشتے سے جبر ملی......... اور آپ......... لوگوں کے ہمراہ دھوبی کے مکان پر گئے۔

دھوبی نے ٹھٹھے سے کہا: حضرت فرمایئے...... اب کوئی اور بد دعا میرے حق میں مانگنے آئے ہیں؟ آپ کی پہلی بد دعا تو بڑی پُراثر نکلی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میرے عزیز میری بد دعا واقعی بڑی پُر اثر تھی، وہ بارگاہِ خدا میں منظور و مقبول بھی ہو چکی تھی، اگر تجھے یقین نہیں آتا تو کل کے دھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھری تو کھولو۔

دھوبی نے سب لوگوں کے سامنے جب گٹھری کو کھولا تو اس میں سے بہت بڑا پھن دار سیاہ ناگ سانپ مردہ ایک کپڑے میں لپٹا ہوا پایا گیا، دھوبی اُسے دیکھ کر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، اب لوگوں کو بھی یقین ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ کی بد دعا خالی

نہیں گئی۔ مگراس پر سب کو حیرت ہوئی کہ دھوبی کے بجائے سانپ کیسے مرگیا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دھوبی سے پہلے دن کی تمام واردات پوچھی۔ دھوبی نے فقیر کے آنے ، اُس کو کھانا کھلانے اوراس کے دعا دینے کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔

آپ نے کہا: میری بددعا تو پوری ہوچکی تھی ۔ یہ سانپ اس گٹھری میں حکم الٰہی سے داخل ہوا تھا کہ جونہی گھر پہنچ کر تو گٹھری کھولے گا، سانپ ڈس کر تجھے اپنے کیے کی سزا تک پہنچا دے گا۔ مگر تیرا وہ احسان جو تو نے خدا کے ایک مسکین اور خستہ حال بندے کے ساتھ کیا۔ تو نے اُس کو موت سے نجات دلائی، اللہ نے تجھ کو موت سے نجات دلا دی۔ اوراس جان لیوا سانپ کو قتل کر دیا۔ تمام لوگ اس واقعہ کو سن کر حیران وششدر رہ گئے۔ کہتے ہیں ”کر بھلا تو ہو گا بھلا“

دھوبی پراس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ جھٹ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قدموں میں گر پڑا، اور رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ دیکھا آپ نے ایک سچے دل سے فقیر کو کھانا کھلانے کی نیکی نے فقیر کی تو جان بچی ہی دھوبی کی بھی جان بچ گئی۔

پیارے بھائیوں اور بہنوں! یتیموں، مسکینوں ،اپاہجوں اور خستہ حالوں، مجبوروں ، بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ جہاں تک ہو سکے احسان اور نیک سلوک کیا کرو تا کہ خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

●●●

فرض

طلعت خورشید

افراتفری کے عالم میں لوگ آجا رہے تھے۔ سبھی اپنے متعلقین کے لئے پریشان تھے۔ ہر کوئی آنے جانے والوں سے حال جاننا چاہ رہا تھا۔ میں بھی اپنے دونوں بچّوں کے لئے بے چین تھا۔ لوٹ مار آگ زنی کے باوجود میرے قدم رُک نہ سکے۔ میرے جگر کے ٹکڑے چیختے چلاتے تصور کی آنکھوں میں اور ان کی ماں کی ناگفتہ بہ حالت وہ جانے کے لئے بضد تھی۔ سو میں نکل پڑا گھر سے۔ اپنی کار پارک کر کے ابھی میں مین روڈ پر آیا ہی تھا کہ میرے بچّوں کے لئے آٹو رکشہ آتا دکھائی دیا۔

میرے قدموں کے رفتار کچھ اور بڑھ گئی، اضطراری کیفیت، مغلظات تو بکنے کی عادت نہیں تاہم کچھ سخت کلمات زبان سے نکلنے ہی والے تھے کہ رکشے والے نے تیزی سے رکشہ نزدیک لاتے ہوئے کہا ”صاحب جی جلد آیئے صاحب جی دیر نہ کیجئے ورنہ بلوائی آجائیں گے، صاحب بڑی مشکل سے بچّوں کو لے کر آیا ہوں“ بچّوں کی خیر و عافیت پا کر تسلی ضرور ہوئی، پھر بھی میری زبان پھسل گئی۔ بڑا احسان کیا

ہے یار...... اگر میرے بچّوں کو کچھ ہو جاتا تو؟ تو میں تمہیں......

پاپا جی......! انکل کو کچھ مت کہیئے۔ میرے بیٹے نے میرے ہونٹوں پر اپنی نرم نازک انگلیاں رکھ دیں۔ میری بیٹی بھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک میری نظر رکشے والے کے چہرے پر پڑی۔

سوجا ہوا چہرہ، لال آنکھیں، ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ سخت کلمات میں نے کہہ تو دیئے تھے مگر میں فطرتاً بے حد نرم دل ہوں فوراً نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ بھائی معاف کر دو...... رو کیوں رہے ہو؟ بات دراصل یہ ہے کہ شہر میں فساد کی وجہ سے بچّوں کیلئے ہم لوگ پریشان ہو گئے تھے، ان کی ماں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

جی صاحب! کون بے رحم ہوگا جو ایسے حالات میں اپنے بچّوں کے لئے پریشان نہ ہوگا؟ صاحب جی میں سمجھ رہا تھا وہ رکتے ہوئے بولا۔ مگر کیا بتاؤں بات ہی کچھ ایسی ہو گئی کہ میں آپ کے بچّوں کو پہلے نہ لا سکا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیجا تھا دوسرے بچّے لوگ تو آ گئے پر یہ بچہ لوگ انجان آدمی کے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ میرے بچّوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا وہ۔

کیا مطلب؟ کس کو بھیجا تھا کسی اور کو کیوں بھیجا تھا؟ میں نے سوال کیا۔

اپنے آنسو پوچھتے ہوئے رکشے والے نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ صاحب! میں نے سنا کہ شہر میں آگ زنی، لوٹ مار، خون خرابہ ہو رہا ہے، میں فوراً آپ لوگوں کے بچّوں کو لینے نکل پڑا۔ راستے میں اسکول آیا، جس میں میرا اکلوتا بیٹا پڑھتا تھا اور پھپھک کر رو پڑا...... میں گھبرا گیا...... پڑھتا تھا کیا مطلب؟

میرے بھائی کیا ہوا تمہارے بچّے کو؟ ایسے کیوں روئے جا رہے ہو۔ میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی، مگر اس کے آنسو تھمے نہیں۔ اتنے میں میرا مکان آ گیا اور اس نے رکشہ روک دیا۔

اترتے ہوئے اپنا سوال میں نے پھر دوہرایا۔ تو اس نے بتایا صاحب جی! میرا بچہ تو وہاں چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ دنگائیوں کے بم کا شکار بہت سے لوگ ہوئے، کئی بچے بری طرح زخمی ہوئے، نہ جانے کتنے اور مرے ہوں گے۔ انہیں میں میرے کلیجے کا ٹکڑا بھی۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کن الفاظ میں اس بیچارے کو تسلی دوں۔ کہ وہ خود بول پڑا۔ اچھا صاحب جی میں چلتا ہوں، بچے کی لاش لے کر جیسے ہی گھر پہنچا تھا کہ میرے ساتھی نے آکر بتایا تمہارا دو بچہ لوگ مجھے نہیں پہچانتا۔ ماسٹر لوگ بھی انجان کے ساتھ نہیں بھیجتا۔ بچہ لوگ روتا ہے۔ سو میں نے سوچا اگر ان بچوں کو کچھ ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ اس ٹائم میرے اپنے بچے کے لئے جیسے میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے کسی اور کا میری وجہ سے نہ پھٹے۔

صاحب جی...... اللہ کو کیا جواب دیتا۔ ذمہ داری اور فرض تو نبھانا ضروری ہے نا صاحب جی۔ اس نے رکشہ گھماتے ہوئے کہا، اچھا اب میں چلتا ہوں آپ اپنے بچہ لوگوں کو سنبھالیں۔ میں ابھاگا باپ...... وہ پھر رو پڑا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا اس نے رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا صاحب جی! امیت کو دفنانے کا اُپائے کرنا ہے۔

اس کا رکشہ دور جا چکا تھا اور میں اپنی دہلیز پر کھڑا سوچ رہا تھا کاش اپنی ذمہ داری اور فرض کا احساس ان لوگوں کو بھی ہو جو رکشے والوں اور اس طبقے کے دیگر لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں، دل آزاری کرتے ہیں اور اپنی حیثیت اور کرسی کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ واقعی ذمہ داری کا احساس فرض شناسی، ایثار اور انسانیت کسی کا حصہ نہیں۔ شرافت کسی کی جاگیر نہیں۔ اپنی انگلیوں میں دبا ہوا نوٹ میں نے اپنی جیب میں گرا دیا جسے چاہ کر بھی اسے دے نہ سکا تھا۔

گذرا ہوا زمانہ

سرسید احمد خان

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراونی ہے، اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد کرتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلہ ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر، ماں، باپ، بھائی، بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اتنے میں اسے اپنے ہم مکتب یاد

آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا۔ ہائے وقت! ہائے وقت! ہائے گذرے ہوئے زمانے افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ، سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، نیلی آنکھیں موتی کی لڑی سے دانت، اُمنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔

اس آنکھوں میں اندھیرا اچھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی باتیں بتاتے تھے تو یہ کہتا کہ ''اوہ ابھی بہت وقت ہے'' اور بڑھاپا آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گذر گیا، آہ وقت گذر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا، کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اُڑتے ہیں اور تنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلا کر بولا ہائے ہائے میری گذری ہوئی جوانی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے جیسی یہ اندھیری رات، یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اسے چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے، یہ کہتی ہوئی کہ ''ہائے بیٹا وقت گذر گیا'' باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے اور اس کو یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے

خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہیں۔ دوست آشنا غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس سب کو وہ اپنی باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض رکھنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا، اور اس پران گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیونکر اس کا بدلہ ہو۔

وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا، لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے، پر رات ویسی ہی اندھیری ہے، اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اتنے میں اس کو اپنا اڈھیرپن یاد آیا۔ جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا اور زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا، یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی۔ اپنی مدد کو پکارتا تھا مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے ۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں یا تو ٹوٹ کر کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں، کنوئیں اندھے پڑے ہیں، نہ پیر، نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جو تمام فانی چیزوں سے دل لگایا یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا۔ ہائے وقت ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان

صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کیلئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟'' وہ بولی ! کہ ''میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔'' اس نے پوچھا کہ ''تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔'' وہ بولی ''ہاں ہے، نہایت آسان، پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دُنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخر تک رہے گا۔ جو بھلائی کے انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی موت اُن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسانوں کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی بھلائی تو میں دل و جان و مال سے ساعی ہو'' یہ کہہ کر وہ دُلہن غائب ہوگئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی غرض سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دُلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کے عالم میں چلاّ اُٹھا۔ ''ہائے وقت! ہائے وقت! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں اس کا باپ اس کو دکھائی دیا چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آکھڑے ہوئے، اماں نے کہا ''بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے کیوں تو بیقرار ہے، کیوں تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اُٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں'' تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا اب تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دُلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا۔ ''اوہ یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دُلہن کو بیاہ لوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتایا۔ او خدا، او خدا تو میری مدد کر۔ آمین

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین ●●●

انوکھی وصیت

مہک سجاد

ایک بادشاہ تھا، بہت بڑی سلطنت کا مالک، مگر اولاد سے محروم۔ اُسے وارث کی محرومی کے ساتھ ساتھ یہ بھی غم تھا کہ مرنے کے بعد اس کی سلطنت کا کیا بنے گا۔ دور تک کوئی صحیح جانشین نظر نہیں آتا تھا۔ آخر اُس کی موت کا وقت قریب آ گیا تب اُس نے ناظم قلمدان کو بلا کر یہ وصیت لکھوائی۔ میری تدفین سے فارغ ہو کر صبح سویرے میرے پالتو طوطے کو پنجرے سے آزاد کر دیا جائے۔ وہ جس شخص کے سر پر بیٹھے اسے میری جگہ بادشاہ بنا دیا جائے۔

وہ دور ایسا تھا کہ لوگ وصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور عہد کی پاسداری کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے مرحوم بادشاہ کی وصیت پر عمل کیا اور طوطے کو پنجرے سے آزاد کر دیا۔ طوطا پھڑپھڑا کر اُڑا اور ایک گھسیارے کے سر پر جا بیٹھا۔ لوگوں نے وصیت کے مطابق اُس شخص کو بادشاہ بنانے کی تیاری شروع کر دیں۔ دربار سجایا گیا، مصاحبین نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی، معمولی کی کاروائی شروع ہوئی اور گھسیارے کو تخت پر بٹھا کر اس کے سر پر تاج رکھ دیا گیا۔

اسی اثناء میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ ضیافت کا شایان شان اہتمام کیا گیا تھا لہٰذا کچھ دیر کے لئے دربار برخاست کر دیا گیا۔ سب درباری بادشاہ سلامت کو

کورنش بجالا کر رخصت ہونے لگے، اُس وقت نئے بادشاہ نے اپنے ڈھیر سارے وزیروں اور مشیروں میں سے ایک وزیر کو روک لیا اور اس سے کہا۔ میرا بازو پکڑ کر مجھے تخت پر سے اٹھاؤ۔ وزیر فوراً حکم بجالایا، مگر بادشاہ کی اس نزاکت پر وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکا جسے دیکھ بادشاہ سلامت کو غصہ آ گیا۔ سچ سچ بتاؤ تمہیں میرے کس عمل پر ہنسی آئی؟ اگر تم نے سچ بات نہ بتائی اور جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کرنے کا حکم دے دوں گا۔

'حضور گستاخی معاف' وزیر نے دست بستہ عرض کیا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے آپ گھاس کاٹ رہے تھے۔ آپ گھاس کا بھاری گٹھا سر پر اٹھائے دور تک بیچنے کے لئے لے جاتے تھے، پیٹ بھر کھانا آپ کو نصیب نہیں تھا، پھر اچانک چند گھنٹوں کے بعد بادشاہ بنتے ہی آپ میں اتنی نزاکت کہاں سے پیدا ہوگئی کہ آپ بغیر سہارے تخت پر سے بھی نہ اٹھ سکے۔ 'میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جیسے نااہل وزیروں کی موجودگی میں یہ حکومت کیسے چلتی رہی؟

اس بار وزیر بادشاہ سلامت کی بات سن کر ہنسا تو نہیں البتہ تعجب میں ضرور پڑ گیا کہ آخر اس گھسیارے کا اس بات سے کیا مطلب ہے؟ اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ 'حضور یہ غلام آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا وضاحت فرمائیے گا۔' بادشاہ کہنے لگا۔ 'کم عقلو اس میں وضاحت کیسی، یہ تو سیدھی سادی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں نے تخت پر سے اٹھتے ہوئے تمہارا سہارا طلب کرکے یہ اشارہ دینے کی کوشش کی کہ پہلے میں گھاس کا بوجھ اٹھاتا تھا مگر اب مجھ پر سلطنت کا بار آن پڑا ہے لہٰذا مجھے اس کام میں تم وزیروں کی ضرورت پڑے گی، لیکن افسوس تم اس نکتے کو سمجھ ہی نہیں پائے۔

یہ سنتے ہی وزیر نے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کا نعرہ بلند کیا اور نہایت ادب سے گویا ہوا۔ 'درست فرمایا حضور خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔''

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

محمد اویس علی

کسی جنگل میں دو چوہے رہتے تھے۔ ایک کا نام گوتی اور دوسرے کا نام جوتی تھا۔ وہ دونوں جنگل میں بہت خوش تھے۔ جب انہیں بھوک لگتی تو جنگل میں درختوں سے طرح طرح کے پھل توڑ کر کھاتے اور جب پیاس لگتی تو جنگل میں بہنے والی ندی سے پانی پی لیتے۔ غرض کہ انہیں جنگل میں ہر چیز کی سہولت میسر تھی لیکن وہ دونوں اس یکسانیت سے تنگ آ گئے تھے لہٰذا انہوں نے شہر کا رُخ کیا۔ شہر کی بڑی بڑی عمارتیں خوبصورت مکانات اور وہاں کے لوگ انہیں بہت اچھے لگے لہٰذا پورا دن سیر کرنے کے بعد انہوں نے رات کو ایک گھر میں پناہ لینے کا سوچا جب وہ دونوں گھر کے کچن میں پہنچے تو وہاں پر موجود طرح طرح کے بسکٹ چپس اور پنیر دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انہوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جب گوتی شیلف پر رکھی ہوئی پنیر کی طرف لپکا تو وہ ایک مرتبان سے ٹکرایا جس کے باعث مرتبان گر کر ٹوٹ گیا اور تمام گھر والے جاگ گئے۔ اب گھر کا مالک ہاتھ میں ڈنڈا لے کر گوتی کی طرف لپکا تو گوتی اور جوتی نے باہر کی

طرف دوڑ لگائی۔ باہر گوتی ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرانے ہی والا تھا کہ وہ دھڑام سے ایک گڑھے میں گر گیا جس کا ڈھکنا کھلا تھا اب تو گوتی اور جوتی دونوں پریشان ہوئے کیونکہ سامنے سے بڑا سا ٹرک بھی آ رہا تھا۔ جوتی نے جلدی سے گڑھے میں اپنی دم گرائی جس پر چڑھ کر گوتی باہر نکلا۔ ابھی وہ اس مصیبت سے نکلے ہی تھے کہ ایک بلی نے ان کو دیکھ لیا۔ موٹے موٹے چوہوں کو دیکھ کر بلّی کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ ان کی طرف لپکی۔ اس افتاد پر دونوں نے جنگل کی طرف دوڑ لگا دی اور وہاں پہنچ کر ہی دم لیا۔ جنگل میں پہنچتے ہی انہوں نے سوچا کہ خدا نے ہمیں رہنے کے لئے اتنا اچھا گھر اور کھانے پینے کا سامان دیا لیکن ہم اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے شہر کی طرف چل پڑے۔ اب دونوں ہی اپنی سوچ پر بہت شرمندہ تھے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔

●●●

دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر

صفدر شاہین

چالاکو لومڑی جنگل سے نکل کر دریا پر پانی پینے گئی تو وہاں ایک گیدڑ بیٹھا دکھائی دیا۔ اس گیدڑ کا رنگ نیلا تھا۔ لومڑی نے آج تک نیلا گیدڑ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے گیدڑ کے پاس آ کر پوچھا۔ ''گیدڑ بھائی! تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟''

گیدڑ نے جواب دیا۔ ''میں نیلا پربت کے جنگل سے آیا ہوں''۔

''نیلا پربت......؟'' لومڑی نے حیرت سے کہا۔ ''کیا کسی ملک کا نام ہے؟''

''ہاں'' گیڈر نے کہا۔ ''نیلا پربت نیلے پہاڑ کو کہتے ہیں۔ پہاڑ کی طرح اس علاقے کے جانور بھی نیلے ہیں لیکن بارش نہ ہونے کے سبب وہاں کا سرسبز جنگل خشک ہو گیا ہے۔ اب وہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا اس لئے مجھے یہاں آنا پڑا۔ تمہارا جنگل کیسا ہے؟''

چالاکو لومڑی نے بڑے فخر سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ ہمارا جنگل نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ اللہ کی تمام نعمتیں ہمیں دستیاب ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کی کوئی کمی نہیں ہے''۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے جنگل میں رہوں گا۔" نیلے گیدڑ نے کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کیسی۔ وہاں جس کا دل چاہے آ کر رہے۔ ساری زمین اللہ کی ہے۔ سب کو یہاں رہنے کا حق ہے۔"

نیلا گیدڑ خوش ہو کر لومڑی کے ساتھ چل پڑا۔ لومڑی اسے اپنے جنگل میں لے آئی اور نیلا گیدڑ مزے سے وہاں رہنے لگا۔ اس جنگل کے جانوروں نے نیلے گدڑ کو دیکھا تو بہت حیران ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "کتنا خوبصورت رنگ ہے اس گیدڑ کا شاید یہ زمین کی مخلوق نہیں ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ چاند سے آیا ہے۔" ایک بندر نے ہنس کر کہا۔

ایک لنگور بولا۔ "میں نے اسے چالاکو لومڑی کے ساتھ آتے دیکھا تھا۔ چلو اسی سے پوچھتے ہیں۔"

وہ جانور چالاکو لومڑی کے پاس گئے تو نیلا گیدڑ بھی وہاں موجود تھا۔ بندر نے لومڑی سے پوچھا۔ "چالاکو! یہ گیدڑ کون ہے؟"

"یہ میرا مہمان ہے" چالاکو لومڑی نے کہا۔ "اب یہ یہاں رہے گا۔"

"مہمان تو ہے مگر آیا کہاں سے ہے۔ چاند سے یا مریخ سے؟" گنجے لنگور نے پوچھا۔

"میں چاند سے آیا ہوں۔" نیلا گیدڑ بولا۔ "میں چاند کا شہزادہ ہوں۔"

"شاید اسی لئے تمہارا رنگ نیلا ہے۔" بھالو نے کہا۔

لنگور بولا۔ "چاند کے شہزادے! تم یہاں کس کی اجات سے رہنے آئے ہو؟"

"مجھے کسی کی اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میری مرضی جہاں بھی رہوں۔" نیلے گیدڑ نے غصّے سے کہا۔ "جاؤ اپنا کام کرو۔ ورنہ سب کی ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔"

یہ سن کر جانور ڈر گئے۔ اتنے میں ٹارزن اور منکو اِدھر آ نکلے۔ جانوروں نے انہیں نیلے گیدڑ کے بارے میں بتایا۔ ٹارزن نے گیدڑ سے کہا۔ ''چاند پر تو جاندار نہیں ہوتے تم کس چاند سے آئے ہو؟''

''جہاں سے بھی آیا ہوں۔ تم پوچھنے والے کون ہو۔ جاؤ اپنا راستہ پکڑو۔'' نیلے گیدڑ نے غصّے سے کہا۔

لومڑی نے گھبرا کر نیلے گیدڑ سے کہا۔

''ادب سے بات کرو۔ ٹارزن ہمارا سردار ہے۔ اس کی عزت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔'' منکو نے غصے سے نیلے گیدڑ کو گھورا اور ٹارزن سے بولا۔ ''سردار! کہو تو دو چار گھونسے مار کر اس کا دماغ درست کر دوں۔''

''نہیں۔ آؤ چلیں۔ بے چارہ ابھی نیا نیا ہے نا۔'' ٹارزن نے ہنس کر کہا۔ ''چالاکو اسے یہاں کے سارے اصول سمجھا دے گی۔''

منکو نے ٹارزن کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے لومڑی سے کہا۔ ''چالاکو! اسے یہ بھی سمجھا دینا کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔''

اس کی بات سن کر چالاکو لومڑی مسکرائی۔ پھر نیلے گیدڑ کو سمجھانے لگی۔ ''اپنے سے طاقت ور کے ساتھ دشمنی نہیں رکھنی چاہئے۔ ارے تم تو گیدڑ ہو، یہاں کے تو شیر بھی ٹارزن کو اپنا سردار مانتے اور اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

لومڑی کی باتیں نیلے گیدڑ کی سمجھ میں آ گئیں اور اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ان اصولوں پر عمل کرے گا۔

●●●

ویرانی

صداقت حسین ساجد

کسی درخت پر ایک کبوتر کا اپنی بیٹی کے ساتھ بسیرا تھا۔ وہ وہاں بڑے عرصے سے رہ رہے تھے اب کئی دنوں سے انہیں اپنے ایک عزیز کی یاد ستا رہی تھی.......... ایک دن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ملنے جائیں گے۔ دوسرے ہی دن انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا.......... یہ سفر کئی دنوں کا تھا۔

اڑتے اڑتے وہ ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے .... جو انتہائی سرسبز وشاداب تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ وہ تھک چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہاں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ انکی ملاقات ایک اُلو سے ہوگئی۔

اُلو نے انہیں اپنا مہمان بنا لیا اور ان کی خوب خاطر تواضع کی...... صبح تک وہ آپس میں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ ساتھ ہی اُلو نے ان سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ واپسی پر بھی اس کے ہاں ضرور آئیں گے۔

انہوں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کر دیا۔ آخر کار کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ

اپنے اس عزیز کے ہاں جا پہنچے۔ایک طویل عرصے بعد ان کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی۔اس لئے اس نے چھ ماہ تک انہیں کہیں جانے نہ دیا۔ بڑی مشکل سے اب بھی انہوں نے اجازت لی کیونکہ اب بھی وہ انہیں نہیں جانے دے رہا تھا۔

انہوں نے واپسی کی راہ لی۔راستے میں انہوں نے سوچا کہ کیوں نا اُلو بھائی سے ملتے جائیں.........

جانے پھر کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو۔

جب وہ اس علاقے میں پہنچے،تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں اب ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ جو علاقہ چھ ماہ پہلے سرسبز و شاداب تھا۔اب اجڑ کر رہ گیا تھا۔ کہیں بھی ہریالی نہیں دکھائی دے رہی تھی .... یہ دیکھ کر وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے:

''لگتا ہے کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں اور کسی اور علاقے میں جا نکلے ہیں۔''

شاید وہ اسی بات پر یقین کر کے اپنی راہ لے لیتے ....اگر انکی ملاقات اُلو سے نہ ہو گئی ہوتی۔ ملنے ملانے کے بعد پہلا سوال کبوتر نے یہی کیا۔

''اُلو بھائی! کیا بنا اس علاقے کو......... کہاں گئیں اس کی رونقیں اور ہریالی......... کس کی نظر لگی ہے اس کو؟''

''آج آپ لوگ تھکے ہوئے ہیں ....اب آرام کریں......... میں اس بات کا جواب کل دوں گا کہ اس علاقے کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟''

دوسرے دن کبوتر نے اُلو سے کہا:

''اُلو بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ! اب ہمیں اجازت دو گھر کی یاد ستا رہی ہے۔اب آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔'' یہ سن کر اُلو بولا: ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو.........لیکن.........؟'' کیا کیا؟

''لیکن یہ کہ تم صرف اکیلے جا سکتے ہو۔'' کیا مطلب.........؟

''تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔'' اُلو نے کبوتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیوں......؟ میں اپنی بیٹی کو کیوں نہیں ساتھ لے جاسکتا۔'' کبوتر چلا اٹھا۔

''وہ اس لئے کہ یہ تمہاری نہیں میری بیٹی ہے۔'' ''ارے! تمہارے دماغ تو درست ہے نا! کیسی بے پر کی اڑا رہے ہو...... بھلا کبھی کبوتری بھی اُلو کی بیٹی بنی ہے......؟''

''کیوں نہیں، بن سکتی......؟''

کبوتری اُلو کی بے سروپا بات سن کر ایسی حیران ہوئی کہ وہ بول ہی نہ سکی۔

ایسے ہی ان کی آپس میں کافی دیر تک تکرار ہوتی رہی۔ آخر میں اُلو نے کہا: ''ٹھیک ہے...... اگر تم یوں نہیں مانتے، تو چلیں قاضی کے پاس............ اس نے جو فیصلہ کر دیا............ وہ ہم دونوں کو منظور ہوگا۔''

''ٹھیک ہے'' کبوتر بھی راضی ہو گیا۔

''وہ قاضی کی عدالت میں پہنچے اور اپنا اپنا موقف پیش کیا۔ کبوتر کو یقین تھا کہ فیصلہ اس کے ہی حق میں ہوگا۔ مگر قاضی کا فیصلہ سن کر وہ دھک سے رہ گیا۔ قاضی نے کہا:

یہ اُلو کی بیٹی ہے۔''

اب کیا ہوسکتا تھا............ جب قاضی نے ہی اُلو کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا۔ کبوتر اپنی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے باہر نکلا............ اس کے پیچھے پیچھے اُلو بھی تھا۔ کبوتر اڑنے ہی والا تھا کہ اُلو نے کہا: ''کبوتر بھائی! اپنی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' کبوتر حیرت سے بولا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم مجھ سے اس معاملے پر لڑ

رہے تھے اور قاضی نے بھی تمہارے ہی حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ اب کہہ رہے ہو کہ یہ میری بیٹی ہے تو پھر یہ سب ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی............؟''

''یہ ڈراما نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا تھا............؟''

''تم نے مجھ سے رات کو پوچھا تھا کہ اس علاقے کے اجڑنے اور ویران ہونے کا کیا راز ہے............ میں نے تمہیں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ جب کسی علاقے میں عدل وانصاف اور حق کا اسی طرح خون ہو............ بے انصافی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہو، تو اسی طرح علاقے اجڑ جایا کرتے ہیں............ ہر طرف ویرانی پھیل جاتی ہے............ جس طرح یہ اجڑا ہے۔ اور ویران ہوا ہے۔ اب تم جلدی سے اپنے گھر جاؤ اور اپنے علاقے کو اجڑنے سے بچالو۔''

کبوتر اور اس کی بیٹی کبوتری نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی۔

●●●

خلیفہ کی امانتداری

پرویز اشرفی

اسکول میں سبھی کلاس پرسکون ماحول میں جاری تھے۔ یکا یک دور سے چند آوازیں سنائی دیں، رفتہ رفتہ وہ آوازیں نزدیک ہوتی جاتیں۔ اب سبھی بچّے اپنے اپنے درجے سے باہر نکل کر سڑک کی طرف جھانکنے لگے۔ انسانوں کی لمبی قطار ہاتھوں میں مختلف قسم کی تختیاں اُٹھائے اپنے مطالبے کے حق میں نعرہ لگاتے ہوئے جارہے تھے۔ ملک میں پھیلی بدعنوانی اور رشوت خوری کے خلاف عوام نے سڑکوں پر اُتر کر احتجاج اور مظاہرہ کا راستہ اپنایا تھا۔ تھوڑی دیر میں جلوس گزر گیا اور سبھی طلبہ اپنی جماعت میں بیٹھ گئے۔ پڑھائی دوبارہ شروع ہوگئی۔ اتنے میں مدثر نے اعجاز سر سے پوچھا۔ ''سر! یہ اتنی بڑی بھیڑ سڑکوں پر تختیاں لے کر کیوں نکلی ہے؟ اور یہ لوگ کیسی بدعنوانی کے خلاف جانچ کرانے کو کہہ رہے تھے؟

''بچّے! آپ نے اچھا سوال کیا۔ میں آپ کو اس بارے میں سمجھاتا ہوں، اتفاق سے آج کا سبق بھی ''بدعنوانی کیسے دُور ہو؟'' ہے۔ جب کوئی حکمراں اپنے ملک میں عوام کی دیکھ بھال نہیں کرتا، عوام کی فلاح و بہبود کا خیال نہیں رکھتا، عوام

کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں سے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنے چنندہ مصاحبوں کی خوشامدانہ باتوں میں گھر جاتا ہے تو نظامِ حکومت پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اور مختلف شعبہ کے کارکنان اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے سے کترانے لگتے ہیں۔ اگر کوئی کام کرتے بھی ہیں تو فرض سمجھ کر نہیں بلکہ بوجھ مان کر، وہ بھی اس کے لئے موٹی رقم عوام سے بطور رشوت لے کر کرتے ہیں۔ اس طرح کے عمل سے ملک میں بداعمالی کے ساتھ ساتھ بدامنی پھیلتی ہے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے تو جمہوری حکومت میں عوام اپنی آواز حکمراں تک پہنچانے کے لئے ایسے ہی جلوس نکال کر احتجاج درج کراتے ہیں۔

''حکمران ایسی بے پروائی کیوں کرتے ہیں؟'' ایک طالب علم نے سوال کیا۔

''بات یہ ہے کہ آج کل ہمارے حکمراں طبقہ کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔ اُنہیں یہ احساس ہی نہیں کہ ایک دن سارے جہان کے حکمرانوں کا سب سے بڑا بادشاہ جو ہم سب کا خالق و مالک ہے اُن سے باز پرس کرے گا۔''

''کیا سبھی حکمراں ایسے ہی ہوتے ہیں سر؟''

''بالکل نہیں۔ اللہ نے اس دُنیا میں بہت سارے نیک انسان بھی پیدا کئے ہیں اور نیک حکمراں بھی۔ دُنیا ایسے نیک سیرت اور نیک طینت انسانوں سے خالی نہیں ہے۔''

استاد کا جواب سن کر بچّوں نے کہا ''کوئی ایسا حکمراں گزرا ہے جو نہایت ایماندار منصف ہو؟''

''ایک ہی نہیں بہت سے حکمراں ایسے گزرے ہیں جو صرف عوام کے لئے دن رات ایک کرتے تھے بلکہ اللہ سے خوف کھاتے تھے کہ اگر انہوں نے اللہ کے بندوں کی خبر گیری نہ کی تو قیامت کے روز میں اللہ کے سامنے کیا جواب دیں گے۔''

آیئے میں آپ کو ایسے ہی ایک حکمراں کا قصہ سناتا ہوں۔ایک مشہور خلیفہ گزرے ہیں۔ اتنے ایماندار اور نیک تھے کہ آج کے دور میں ایسی مثال مشکل سے ملے گی۔

اُن کے دورِ حکومت میں سرکاری خزانہ میں جو کچھ بھی جمع ہوتا تھا اُسے وہ عوام کی امانت سمجھتے تھے۔اس لحاظ سے خزانے کی بڑی حفاظت کیا کرتے تھے۔ آج کل کے حکمراں تو سرکاری خزانے کو اپنے گھر کا مال سمجھ کر اپنے ذاتی اخراجات میں صرف کرتے ہیں۔یعنی پیسہ عوام کا اور خرچ کرتے ہیں سرکاری افسر اور وزیر۔اسی لئے تو ملک میں بدعنوانی کے روز نئے نئے انکشاف ہو رہے ہیں۔ غریب عوام غریب تر ہوتی جارہی ہے اور دوسری طرف وزیروں اور افسروں کے اہل خاندان امیر تر ہوتے جارہے ہیں۔ایک قسم سے سرکاری خزانہ کی لوٹ مار ہو رہی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا ایک دن کا واقعہ ہے کہ اُس خلیفہ کے سرکاری خزانے میں بہت سے سیب آئے ۔ دستور کے مطابق وہ اُن سیبوں کو رعایا میں تقسیم کر رہے تھے۔اتفاق سے خلیفہ کا چھوٹا بیٹا کھیلتے کھیلتے اُس طرف آ گیا۔وہ بچّہ تھا تو نادان بھی تھا۔اُسے کیا معلوم کہ یہ سیب جو اُس کے والد لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں کس کے ہیں؟ سیب پر نظر گئی تو بچّے کا ذہن، اُس نے سمجھا کہ سیب سب اُس کے والد کے ہیں جو تقسیم کر رہے ہیں۔ پھر کیا تھا ٹوکری سے ایک سیب اُٹھایا اور کھانے چلا۔

اب خلیفہ نے بچّے کی یہ حرکت دیکھی تو لرز گئے ۔کیوں کہ سیب تو سرکاری تھے اور سرکاری چیزوں پر ساری رعایا کا حق ہوتا ہے ۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے بچّے کے ہاتھ سے سیب واپس لے لیا۔ہاتھ سے سیب چھن جانے کی وجہ سے بچہ رونے لگا۔ادھر خلیفہ کو یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر بچہ سیب کھالیتا تو رعایا کے مال

میں خیانت ہوتی۔ بچّے کو بہت پچکارا، بہلایا لیکن وہ نہ مانا اور روتا ہوا اندر والدہ کے پاس چلا گیا۔

ماں نے بچّے کو جب روتے دیکھا تو کیفیت پوچھی، اُس نے سارا قصہ شکایت کے طور پر کہہ دیا۔ ماں نے جب قصہ سنا تو اپنے بچّے کے آنسو پونچھے اور بازار سے سیب خرید کر کھانے کو دیا۔ خلیفہ جب سارے سیب تقسیم کر کے اندر آئے تو انہیں سیب کی خوشبو محسوس ہوئی۔ انہوں نے بیوی سے دریافت کیا کہ گھر میں کوئی سرکاری سیب تو نہیں رہ گیا ہے۔''

بیوی نے بتایا کہ ''سرکاری سیب تو نہیں لیکن میں نے بچّے کو بازار سے سیب منگا کر کھانے کو دیا ہے۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آکر شکایت کر رہا تھا کہ آپ نے اس سے سیب لے لیا ہے۔ کسی طرح بہل نہیں رہا تھا۔ اس لئے میں نے بازار سے منگا کر اُسے چپ کرایا۔''

خلیفہ نے سنجیدہ لہجے میں بیوی سے کہا۔ ''کیا کرتا! سیب سرکاری خزانے کے تھے۔ میں نے اپنے بچّے سے سیب صرف اس لئے چھین لیا تھا کہ یہ سب عوام کی امانت ہے اور ایک سیب کے لئے میں اللہ کے یہاں بے ایمان نہ ٹھہرایا جاؤں۔'' خلیفہ کی بات سن کر ان کی بیوی مطمئن ہو گئیں۔

''پیارے بچو! کیا تمہیں معلوم ہے خلیفہ کا نام کیا تھا؟''

نہیں۔

''تو سنو! اُن کا نام تھا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ''۔

●●●

سچّا انصاف

حضرت عمرؓ مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔ آپ اپنے فرض سے خوب واقف تھے۔ دن میں تو آپ اپنے فرائض کی ادائیگی میں لگے ہی رہتے تھے، رات میں بھی بہت کم آرام فرماتے اور زیادہ رعایا کی خبر گیری کے لیے گشت لگایا کرتے تھے۔ ایک رات جب گشت لگا رہے تھے تو اچانک ایک جھونپڑی پر نظر پڑی۔ دیکھا ایک عورت چولہا جلائے بیٹھی ہے۔

اُس کے بچّے رو رہے ہیں۔ عورت اُنہیں بہلا رہی ہے، مگر وہ کسی طرح خاموش نہیں ہوتے۔ بچّوں کو روتا بلکتا دیکھ کر حضرت عمرؓ کا دل بھر آیا۔ آپ قریب گئے۔ دیر تک دیکھتے رہے مگر آپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر عورت کے پاس جا کر بچّوں کے رونے کا سبب پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ بچّے بھوک کے مارے بلک رہے ہیں۔

"آپ انہیں کھانا کیوں نہیں دیتیں"؟ حضرت عمرؓ نے پوچھا: "میں اتنی دیر سے کھڑا دیکھ رہا ہوں، چولہے پر ہانڈی چڑھی ہے، آخر یہ کب تیار ہوگی؟"

"ہانڈی میں کچھ نہیں ہے"۔ عورت نے جواب دیا۔ "بچّوں کو بہلانے کیلئے صرف پانی چڑھادیا ہے، چاہتی ہوں کہ کسی طرح انہیں نیند آجائے اور یہ سوجائیں"۔

حضرت عمرؓ نے دیکھا تو واقعی ہانڈی میں صرف پانی اور کچھ کنکریاں تھیں۔ اس عورت کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا، بچّے بھوک سے بے حال ہورہے تھے۔ اُن کی تسلی کے لیے عورت نے چولھا جلا کر ہانڈی میں پانی اور کنکریاں ڈال دی تھیں تاکہ بچّے یہ سمجھیں کہ کھانا پک رہا ہے، عورت بے چاری بیوہ تھی، بچّے لاوارث اور یتیم تھے، گھر میں کمانے والا کوئی نہ تھا۔

بیت المال سے بھی کوئی وظیفہ مقرر نہیں ہوا تھا۔

آپ نے درد بھرے لہجے میں کہا:

"مائی"! خلیفہ کو تم نے اطلاع کیوں نہ دی؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میرے اور عمرؓ کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ میں اُن سے کیوں کہوں گی، اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کی خبر گیری کریں اگر وہ اپنا فرض پورا نہیں کر سکتے تو اُن کو خلیفہ بننے کا کیا حق ہے؟"

حضرت عمرؓ پریشان ہوگئے۔ یہ سُن کر وہ فوراً بیت المال پہنچے۔ آٹا، گھی اور کھجوریں لیں۔ پیٹھ پر لاد کر چلنے لگے تو آپ کے غلام نے کہا۔

"امیر المومنینؓ! آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔ لائیں میں پہنچادوں"۔

حضرت عمرؓ نے کہا "نہیں! جب قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے تو آج میں تم سے اپنا بوجھ کیوں اُٹھواؤں"۔

یہ کہہ کر آپ سارا سامان خود لے کر اُس عورت کے پاس پہنچے۔ خود بیٹھ کر چولھا پھونکا۔ کھانا تیار کر کے بچّوں کو پیٹ بھر کھلایا۔ بچّے ہنسی خوشی سو گئے۔

چلتے وقت عورت نے کہا:

''اے رحم دل انسان'' خلیفہ بننے کے لائق تو تم ہو نہ کہ عمرؓ۔

حضرت عمرؓ بولے ''مائی معاف کرنا۔ عمرؓ میں ہی ہوں۔ مجھ سے واقعی کوتاہی ہوئی ہے کہ اب تک آپ کی خبر نہ پوچھی''۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المال سے عورت اور بچوں کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

●●●

دوستی۔ ایک مضبوط ڈور

محمد الیاس انجمؔ

ایک مینڈک ایک تالاب میں بڑے آرام سے زندگی بسر کرتا تھا یوں تو تالاب میں اسے ہر طرح کا آرام میسّر تھا مگر پھر بھی ایک چیز کی کمی اسے بُری طرح کھلتی تھی۔ وہ یہ کہ تالاب میں اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا وہ اکثر اپنی تنہائی کو لیکر بہت پریشان رہتا اور سارا سارا دن اسی تالاب میں ہی تنہا بھٹکتا پھرتا۔ ایک روز اُس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس تالاب سے نکل کر باہر کی دُنیا کا نظارہ کیا جائے۔ اس سے ذرا دل بھی بہل جائے گا اور ممکن ہے کہ کوئی دوست بھی مل جائے۔ چنانچہ مینڈک جب تالاب سے نکل کر کنارے پر پہنچا تو یہاں اسے ایک چوہا نظر آیا۔ وہ اس چوہے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ آخر اُسے رفیقِ تنہائی مل ہی گیا ہے۔

چوہا تالاب کے ساتھ ہی ایک کھیت میں رہتا تھا اور روزانہ پانی پینے کے لئے اس تالاب پر آتا تھا۔ مینڈک کی طرح چوہا بھی کھیت میں بلکل تنہار رہتا اور وہ بھی اپنی تنہائی سے کافی بیزار تھا چنانچہ مینڈک نے جب اُس کے سامنے دوستی کا

ہاتھ بڑھایا تو اُس نے فوراً خوشی خوشی اسے اپنا دوست قبول کرلیا۔ چوہے کے پاس کھیت میں کھانے کیلئے طرح طرح کی چیزیں تھیں۔ وہ جب کبھی پانی پینے کے لئے تالاب کے کنارے آتا تو اپنے دوست کے لئے بطورِ تحفہ کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتا۔ ادھر مینڈک بھی پہروں تالاب کے کنارے بیٹھ کر اپنے دوست کی راہ تکتا رہتا۔ بعض اوقات چوہے کو آنے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو مینڈک پریشان ہوا اُٹھتا اور بڑی بے صبری سے اُس کے آنے کا انتظار کرتا اور پھر جب چوہا آتا تو دونوں آپس میں مل کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔

ایک روز چوہے نے مینڈک سے کہا کہ دوست تم پہروں تالاب کے کنارے میرا انتظار کرتے ہو، کبھی مجھے آنے میں دیر بھی ہو جاتی ہے اور تمہیں یونہی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی، میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ہر وقت ایک دوسرے کے رابطے میں رہیں۔ تاکہ جب کبھی مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو میں تمہیں اس بارے میں آگاہ کرسکوں تاکہ تمہیں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ اس کے لئے میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ وہ یہ کہ میں کہیں سے ایک لمبی سی ڈوری لے آتا ہوں اور پھر ہم دونوں اس ڈور کے ایک ایک سرے کو اپنے اپنے پاؤں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لیں گے۔ اس طرح جب کبھی میں تالاب پر آنے کا ارادہ کروں گا تو میں اس ڈور کو کھینچ کر تمہیں آگاہ کردوں گا کہ میں تالاب کی طرف آرہا ہوں اور پھر تم بھی تالاب سے نکل کر کنارے پر آجانا۔ اس طرح تمہیں خواہ مخواہ میرا انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور پھر یہ ڈور ہماری دوستی کی علامت بھی ہوگی۔ جو ہر وقت ہمیں ایک دوسرے کی یاد دلاتی رہے گی۔

مینڈک چوہے کی یہ ترکیب سُن کر بہت خوش ہوا اور اسے جلدی جلدی ڈوری کا انتظام کرنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد چوہا ایک لمبی سے ڈوری لے کر آگیا اور پھر دونوں دوستوں نے حسبِ ترکیب ڈوری کا ایک ایک سرا اپنے اپنے

پاؤں سے مضبوطی سے باندھ لیا۔ چنانچہ اس کے بعد چوہا جب کبھی تالاب پر آنے کا قصد کرتا تو اپنے پاؤں کے ساتھ بندھی ڈوری کو کھینچ کر اپنے دوست کو آگاہ کر دیتا کہ وہ آرہا ہے اور پھر مینڈک بھی تالاب کے کنارے پر آجاتا اور اس طرح یہ دونوں دوست آپس میں ملنے لگے۔ مینڈک اور چوہے کی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کچھ دنوں تک تو یونہی چلتا رہا۔ مگر ایک روز چوہا جب کھیت میں اپنے کھانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک چیل کی اس پر نظر پڑ گئی اور پھر پلک جھپکتے ہی اُس بے رحم چیل نے اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر آسمان کی طرف اُٹھا لیا۔ چونکہ چوہے کے ساتھ اُس کا دوست مینڈک بھی ایک مضبوط ڈوری سے بندھا تھا اس طرح چوہے کے اوپر اُٹھتے ہی اس مینڈک کے پاؤں بھی تالاب سے اُکھڑ گئے۔ اور وہ بھی بے چارہ اپنے دوست کے پیچھے پیچھے اُس چیل کی خوراک جا بنا.........................

●●●

نیک عادات

انسان کو اس کی عادتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان کی عمر جتنی زیادہ ہوتی ہے۔ اتنی ہی اس کی عادتیں پختہ ہوتی جاتی ہیں۔ آپ کی عمر عادتوں کو بنانے کی عمر ہے۔ آج جو عادت آپ میں پڑ جائے گی، وہ ساری زندگی آپ کے ساتھ رہے گی۔ اچھی عادتوں سے فائدے ہوتے ہیں اور بُری عادتوں سے نقصان۔ یہ فائدے اور نقصانات صرف انسان تک محدود نہیں رہتے بلکہ اوروں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

اگر پوری کلاس میں دو بچے وقت کے پابند نہیں، وہ دیر سے آتے ہیں تو سب سے پہلے ان ہی کے دوست متاثر ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اُن کو بھی یہ عادت پڑ جاتی ہے۔ اُستاد پڑھانے کیلئے آتا ہے تو اسے بھی ان کو غیر حاضر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ پڑھانے میں مزا نہیں آتا۔ پڑھائی شروع کرنے کے بعد جب آ جاتے ہیں تو استاد کو کچھ باتیں دُہرانا پڑتی ہیں، جس سے اور بچوں کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔ جب ان سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو یہ ایک دن ایک بہانہ بناتے ہیں اور دوسرے دن دوسرا۔ اصل میں یہ صبح سویرے اُٹھنے کی عادت نہیں ڈالتے اور اس وجہ سے ان کا کتنا نقصان ہوتا ہے۔، یہ وہ نہیں سمجھتے۔ اگر سمجھتے بھی ہیں تو عادت سے مجبور پھر وہی سب کرتے ہیں۔ صبح دیر سے اُٹھنے

کی وجہ سے بچے سکول دیر سے پہنچتے ہیں۔ اسکول کا کام ٹھیک سے نہیں کر پاتے۔ کلاس میں استاد کے سوالوں کا جواب نہیں دے پاتے۔ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے بہانے بنانا پڑتے ہیں۔ اس طرح انھیں دھیرے دھیرے جھوٹ بولنے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ دیر سے جاگنے کی بُری عادت کی وجہ سے بچے اپنی صفائی کی طرف بھی پورا دھیان نہیں دے پاتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ بچے دوڑتے ہوئے اپنی قمیض کے بٹن بند کرتے ہیں اور جوتوں کے تسمے تو اسکول پہنچ کر باندھتے ہیں۔ اصل میں دیر سے جاگنے کی وجہ سے انہیں اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ سلیقے سے اپنا لباس درست کریں۔ ایسے بچے تو اپنی ماں کے لیے بھی تکلیف کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اگر اُن سے دیر سے جاگنے کی خراب عادت چھوٹ جائے یعنی وہ صبح جلدی جاگنے کی عادت ڈالیں تو نہ ان کی ماں کو تکلیف ہوگی اور نہ ان کا لباس بے ترتیب رہے گا۔ اتنا ہی نہیں وہ صفائی پر بھی دھیان دے پائیں گے، ان کے دوستوں کا وقت بھی ضائع نہیں ہوگا۔ استاد کلاس میں آکر خوش ہوگا اور وہ خود بھی روز روز جھوٹ بولنے سے بچ جائیں گے۔

وقت پر کام کرنا بھی ایک اچھی عادت ہے۔ داناؤں کا قول ہے۔ آج کا کام کل پر مت چھوڑو" جو بچے یہ سوچ کر شام کو زیادہ دیر تک کھیلتے ہیں کہ اسکول کا کام کل کریں گے، ان کا کام کبھی پورا نہیں ہوتا۔ کام تو وہ کرتے ہیں مگر اس قدر جلدی اور بے دلی سے کہ ٹھیک سے سمجھنے کو موقع نہیں ملتا اور کہیں نہ کہیں ان کے کام میں کوئی نقص ضرور رہ جاتا ہے۔ جو بچہ وقت پر اپنا کام کرے، صبح جلدی اُٹھے، جھوٹ نہ بولے، صفائی کا دھیان رکھے، اپنا لباس ٹھیک رکھے، اپنے رہنے کی جگہ اور آس پاس کو صاف و پاک رکھے، بھائی بہن سے جھگڑا نہ کرے، اپنے ہم جماعتوں سے پیار سے پیش آئے، استاد کا ادب کرے، وہی بچہ آگے چل کر زندگی میں کامیاب رہتا ہے۔ ●●●

اتفاق

ایک شخص کے سات بیٹے تھے۔ جوان اور تندرست۔ یہ ساتوں بھائی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ چھوٹے بھائی بڑے بھائی کی کوئی بات نہیں مانتے تھے اور بڑا بھائی بھی چھوٹے بھائیوں کو ہمیشہ ڈانٹتا رہتا تھا۔ باپ ان کی اس لڑائی اور ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان تھا۔ اس نے بیٹوں کو بہت سمجھایا کہ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں۔ آپس میں نا اتفاقی ٹھیک نہیں مگر وہ نہ سمجھے۔ ایک دن اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے ساتوں بیٹوں کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ ایک ایک لکڑی لائیں۔ سبھی ایک ایک لکڑی لے آئے۔ باپ نے ان لکڑیوں کو باندھ کر ایک گٹھا بنا لیا۔ یہ گٹھا اُس نے بڑے بیٹے کو دیا اور گٹھے کو توڑنے کے لیے کہا۔ ''بیٹے نے اپنی پوری طاقت صَرف کر کے گھٹا توڑنے کی کوشش کی مگر توڑ نہ سکا۔ اپنے باپ کو گٹھا واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''بابا یہ مجھ سے نہیں توڑا جاتا''۔ باپ نے گٹھا دوسرے بیٹے کو توڑنے کے لیے دیا۔ دوسرے بیٹے نے بھی پوری کوشش کی مگر گٹھا توڑ نہ پایا اور باپ سے بولا ''بابا یہ گٹھا مجھ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا''۔ پھر باپ نے ایک کے بعد ایک گٹھا دوسرے بیٹوں کو دیا اور ہر ایک سے گٹھے کو توڑنے کے لیے کہا مگر سب ناکام رہے۔ باپ نے گٹھا واپس لے کر اُسے کھول دیا۔ ساتوں

لکڑیاں ایک ایک کر کے اپنے بیٹوں میں بانٹ دیں اور اُن کو توڑنے کے لیے کہا۔ ہر ایک نے بڑی آسانی سے اپنی اپنی لکڑی توڑ دی، وہ سب حیرت سے اپنے باپ کو دیکھنے لگے۔ باپ کی یہ ترکیب اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بیٹوں کو حیران دیکھ کر باپ نے کہا، ''بیٹو! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک یہ لکڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں تو یہ سب مضبوط تھیں اور آپ انہیں توڑ نہ پائے۔ جب یہ بٹ گئیں تو بڑی آسانی سے ٹوٹ گئیں۔ اسی طرح اگر آپ اتفاق سے رہیں گے تو کوئی بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

باپ کا یہ جواب سن کر بیٹوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ مل جل کر رہنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے بڑی ترقی کی، اُن کا گھر امن وسکون کی آماجگاہ بن گیا۔

بچّو!

یہ کہانی پڑھ کر آپ کو سمجھ آیا کہ اتفاق میں کتنی طاقت ہے۔ بڑے بڑے کام اتفاق ہی کی بدولت انجام پاتے ہیں۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے مل کر ندی نالے بناتے ہیں۔ یہی ندی نالے مل کر دریا بن جاتے ہیں۔ پانی کے قطروں کی نسبت دریا کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ پتھر، مٹی، چونا مل کر مکان بن جاتے ہیں۔ یہی مکان بستیاں اور شہر بن جاتے ہیں۔ الگ سے اینٹ پتھر یا چونا مکان نہیں ہوتے۔ یہ سب اتفاق کی ہی بدولت ہوتا ہے۔ نا اتفاقی کمزوری کی علامت ہے۔ نا اتفاقی سے کام بگڑ جاتے ہیں۔

●●●

گھوڑا اور ہرن

یہ ہزاروں سال پرانی بات ہے۔ایک ہرن اور گھوڑے میں بڑی دوستی تھی۔ایک بار کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا۔مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ہرن ہلکا پھلکا اور پھرتیلا تھا۔اُس نے اُچھل اُچھل کر گھوڑے کو پیٹا۔مار پیٹ میں گھوڑے کو چوٹ آئی۔اُسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔گھوڑا کچھ نہ کر پایا اور ہرن مار پیٹ کر چلا گیا۔

گھوڑے کو غصہ آیا۔اُس نے سوچا کہ ہرن سے بدلہ لینا چاہئے لیکن بدلہ لے تو کیسے! بہت دنوں تک جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا ایک دن اُس کی نظر ایک آدمی پر پڑی، جو تیر کمان لیے شکار کی تلاش میں پھر رہا تھا۔گھوڑے نے پوچھا:

"آدمی! تم جنگل میں اکیلے کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

آدمی نے جواب: "میں شکاری ہوں اور شکار کی تلاش میں ہوں"

گھوڑے نے کہا: "میں اگر میں تمہیں کوئی شکار دکھا دوں تو کیا تم اس کو مار دو گے؟"

''ہاں کیوں نہیں! میرا کام ہی یہی ہے۔'' شکاری نے کہا۔

اب تو گھوڑا خوش ہوگیا۔ اُس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے شکاری سے کہا: ''اس جنگل میں ایک ہرن رہتا ہے تم چاہو تو اُس کو مار سکتے ہو''۔

شکاری نے کہا: ''مارنے کو تو میں ماردو لیکن تم بتاؤ کہ میں اس کے پیچھے کیسے دوڑ سکتا ہوں؟ ہاں اگر تم میری مدد کرو تم میں اُسے ماردوں''۔

گھوڑے نے کہا: ''میں تیار ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کروں''۔

شکاری نے کہا: ''مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھالو اور وہاں لے چلو جہاں وہ ہرن رہتا ہے''۔

گھوڑے نے شکاری کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا، تو شکار نے کہا: ''بھائی گھوڑے! بات سنو! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے منہ میں لگام ڈال دوں''۔

''لگام سے کیا ہوگا؟'' گھوڑے نے پوچھا۔

شکاری نے کہا: ''لگام سے یہ فائدہ ہوگا کہ جس طرف ہرن نظر آئے گا، میں اُسی طرف لگام موڑ دوں گا تم اُدھر چل پڑنا۔ پھر میں اسے اپنے تیر کا نشانہ بنادوں گا''

گھوڑا تو ہر قیمت پر ہرن سے انتقام لینا چاہتا تھا، اُس نے کہا: ''اچھی بات ہے۔ تم میرے منہ میں لگام ڈال دو''۔

شکاری نے گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال دی اور دونوں ہرن کی تلاش میں نکل پڑے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہرن نظر آیا۔ گھوڑے نے کہا: ''یہی وہ ہرن ہے۔ تم اسے مار ڈالو''۔

شکاری نے گھوڑے کو اُس کے پیچھے ڈال دیا۔ گھوڑا تیز تیز دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے وہ ہرن کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ شکاری نے تیر چلایا۔ تیر ہرن کے سینے پر لگا۔ ہرن نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن تھوڑی دور جاکر گر پڑا۔

اب گھوڑے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کا دشمن مارا گیا۔ اُس نے شکاری سے کہا: ''بھائی شکاری؟ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میرے دشمن

کا کام تمام کر دیا۔ اب تم اپنا شکار لے جا سکتے ہو''۔

شکاری نے کہا: ''اس میں احسان کی کیا بتا ہے۔ مجھے شکار ملا اور اسکے ساتھ ہی ایک اور فائدہ ہوا''۔

گھوڑے نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

شکاری نے کہا: ''مجھے پہلے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے کارمد ہو۔ اب پتہ چلا کہ تم تو بڑے کام کی چیز ہو''۔ یہ کہہ کر اُس نے لگام کھینچی۔ گھوڑا بے چارہ بے بس ہو گیا۔ کرتا تو کیا کرتا۔ شکاری گھوڑے کو بستی میں لے آیا۔ وہ دن اور آج کا دن، گھوڑے کے منھ سے لگام نہیں نکلی اور گھوڑے کا کام یہ ہے کہ وہ آدمی کو اپنی پیٹھ پر بٹھائے پھرتا ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ آپس میں لڑنا، جھگڑنا ٹھیک نہیں۔

●●●

جہاں تک ہو سکے اپنی محنت کی کمائی کھاؤ

محمد الیاس انجم

ایک بار ایک شخص جنگل کے راستے کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اُس نے ایک لومڑی دیکھی جو بغیر ہاتھ پاؤں کے ایک کنارے پر پڑی تھی۔ وہ آدمی اس لومڑی کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس حالت میں کیسے زندگی بسر کرتی ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں کے کہاں سے کھاتی ہے۔ وہ شخص اسی سوچ میں ہی ڈوبا تھا کہ اچانک وہاں پر ایک شیر ایک گیدڑ کو اپنے پنجوں میں دبائے آ گیا۔ شیر نے پہلے اُس گیدڑ کو پیٹ بھر کر کھایا اور اُس کے بعد اس میں جو کچھ بچا اس نے معذور لومڑی کے آگے ڈال دیا۔ اس طرح اُس بیچاری کا پیٹ بھی بھر گیا۔ دوسرے روز بھی اتفاق سے ایسا ہی ہوا۔ شیر اپنا شکار لایا اور اُس لومڑی نے بھی پیٹ بھر کر کھایا وہ بھلا آدمی اس واقعہ کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خدا کی قدرت کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کس کس بہانے سے وہ تمام جاندروں کا پیٹ بھرتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اُس شخص کا خدا پر یقین اور زیادہ مستحکم ہوا اور اُس نے اپنے دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ اب وہ بھی خدا پر بھروسا کر کے مسجد کے ایک

کونے میں بیٹھ جائے گا اور خدا رازق اُس کو وہیں پر کھانا پہنچائے گا۔ اس طرح کچھ دنوں تک وہ شخص یوں ہی مسجد کے کونے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ اور انتظار کرتا رہا کہ خدا اسے غیب سے کھانا دے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور کسی نے اس کا حال تک نہ پوچھا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ جب ضعف اور کمزوری کی وجہ سے بالکل لاغر ہوگیا تو مسجد کے محراب سے ایک غائبانہ آواز آئی ''اے کمینے یہاں سے چلا جا، اپنے آپ کو اس معذور لومڑی کی طرح مت ڈال جو دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی گزارتی ہے۔ بلکہ تو وہ شیر بن جا جو اپنی طاقت اور محنت سے شکار کر کے اپنا پیٹ بھی بھرتا ہے اور دوسروں کو بھی پیٹ بھرنے کے لئے دیتا ہے۔ تو جا! جہاں تک ہو سکے اپنی محنت کی کمائی کھا یوں دوسروں کے سہارے مت پڑا رہ۔ یہ ندا سن کر وہ آدمی وہاں سے نکل گیا اور محنت کر کے دو وقت کی روٹی کھانے لگا۔

(ماخوذ از بوستانِ سعدی 'فارسی')

●●●

لالچ۔ ایک بُرا ریچھ

محمد الیاس انجمؔ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں رحیم اور راجو نام کے دو دوست رہتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ دونوں اکٹھے پلے بڑھے تھے اور جوان ہونے کے بعد بھی وہ ایک ہی گاؤں میں یکجا کام کرتے تھے۔ لہٰذا بچپن ہی سے ان دونوں میں گہری دوستی تھی۔ مگر اس دوستی کے باوجود ان دونوں کی بہت ساری عادتیں ایک دوسرے سے ملتی نہ تھیں۔ رحیم نہایت سیدھا سادہ اور ایک محنت کش انسان تھا وہ ہمیشہ اپنے کام سے مطلب رکھتا تھا۔ اور اکثر تھوڑا کچھ پا کر بھی خوش ہو جاتا اور خدا کا شکر ادا کرتا۔ اس کے برعکس راجو بڑا ہی چالاک اور لالچی قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے چالاک ہونے پر بڑا فخر کرتا تھا اور اکثر اپنی چالاکی اور فریب سے لوگوں کو دھوکا دیتا۔ وہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ پانے کے تگ و دو میں لگا رہتا اور وہ اس قدر لالچی تھا کہ معمولی چیز کے لئے بھی مرمٹتا تھا۔ رحیم اُسے اکثر سمجھاتا کہ خدا نے اُسے جو کچھ عطا کیا ہے اُسے اُسی پر صبر و شکر کرنا چاہئے زیادہ حاصل کرنے کی حوس بسا اوقات انسان کو مصیبت میں ڈال دیتی ہے مگر راجو اپنے دوست کی ان

باتوں پر ذرا بھی دھیان نہ دیتا اور اُلٹا اُس کی شرافت کا مذاق اڑانے لگتا۔

ایک روز کی بات ہے کہ وہ دونوں دوست کام سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا اور وہ دونوں دوست دریا کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے چل رہے تھے کہ اچانک راجو کو دریا میں کوئی شئے بہتی ہوئی نظر آئی وہ شئے دور سے کالے کمبل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ راجو اس کمبل نما شئے کو حاصل کرنے کیلئے بیتاب ہو گیا۔ اُس نے رحیم کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ چونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس سے پہلے ہی وہ اُس چیز تک نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ اُس نے رحیم سے یہ کہا کہ وہ دریا پر ہاتھ منہ دھونے جارہا ہے۔ اور جب تک وہ واپس نہ آئے۔ اُس کا یہیں پر انتظار کرے۔ اس طرح راجو اپنے دوست کو فریب دے کر دریا کی طرف نکل پڑا اور پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے کمبل نما شئے پر چھلانگ لگادی۔ اس کے بعد جب اُس نے ذرا ہوش سنبھالا تو خود کو ایک بڑے سے کالے ریچھ کے ساتھ لپٹا ہوا پایا۔ راجو اُس کالے ریچھ کو دیکھ کر بدحواس ہو اُٹھا اور زور زور سے چیخ و پکار کرنے لگا۔ اب وہ رحیم کو مدد کے لئے پکار رہا تھا مگر جب تک رحیم اُس کی مدد کو وہاں پہنچتا۔ اس کالے ریچھ نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

●●●

سائمن کی حماقتیں

ترجمہ: گل رعنا

سائمن ایک بہت بدھولڑکا تھا۔ وہ کبھی اپنے گھر سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ ایک دن اس کے ٹیچر نے اس سے پوچھا کہ انکی کلاس کے بچّے کیمپنگ کے لئے شہر سے باہر جارہے ہیں، اگر وہ چاہے تو ساتھ چل سکتا ہے۔

''اس سے تم پر اچھا اثر پڑے گا سائمن'' انہوں نے کہا ''تم بہت بھلکڑ ہواور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے بچّے ہو۔ کل اپنی امّی سے جانے کی اجازت لے کرآنا۔''

چھٹی کے بعد سائمن سیدھا گھر بھاگا وہ بہت پر جوش تھا۔ آج سے پہلے کبھی وہ کیمپنگ کے لئے نہیں گیا تھا۔ اس کی امّی نے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا۔

''میں وہاں بہت سے کام سیکھوں گا۔ امّی'' اس نے کہا ''میں سب کی مدد کروں گا، میں ٹینٹ لگانا اور اکھاڑنا سیکھوں گا، برتن دھونا اور کھانا پکانا سیکھوں گا۔ کتنا مزہ آئے گا۔''

خیر جناب، اس طرح سائمن زندگی میں پہلی بار کیمپنگ کے لئے روانہ ہوا۔ یہ لوگ شہر سے باہر کھیتوں کے قریب ایک چھوٹی پہاڑی پر کیمپنگ کرنے گئے تھے۔ سائمن کو اس کے ٹیچر نے ٹینٹ لگانا سکھایا مگر وہ اسے سیکھنے میں ناکام رہا۔ جیسے ہی وہ ٹینٹ لگا کر اس کے اندر داخل ہوتا تھا، ٹینٹ ہمیشہ اس کے اوپر گر پڑتا تھا۔ پھر اسے سکھایا گیا کہ چشمے پر جا کر گندی پیالیاں اور پلیٹیں کیسے دھوئی جاتی ہیں۔ مگر دو بار پانی میں گرنے کے بعد اسے مزید یہ کام کرنے کی اجازنہیں ملی۔

پھر ایک دن اسے ایک بڑا جگ دے کر کہا گیا کہ دودھ لے کر آئے۔ سائمن جگ لے کر چل پڑا مگر اگلے کھیت تک پہنچ کر وہ رک گیا اور سوچنے لگا کہ وہ یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ دودھ اسے کہاں سے ملے گا۔ ''کیا حماقت ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اب اگر واپس جا کر پوچھوں گا تو سب لڑکے مجھ پر ہنسیں گے، پتہ نہیں کل جمی کہاں سے دودھ لے کر آیا تھا؟''

''مواؤ وواؤ!'' قریب سے ہی ایک گائے بولی اور سائمن کو اتنا گھور کر دیکھا کہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی کے سوال کا جواب دے رہی ہے۔

''اوہ! ظاہری بات ہے! دودھ تو گائے دیتی ہے۔'' سائمن نے کہا۔

''ارے گائے ذرا ادھر آنا ایک منٹ کے لئے اس نے گائے کے سامنے جگ لہرایا، مگر اس نے اپنا سر دوسری طرف موڑ لیا اور جگالی کرتی رہی۔ وہ آرام کر رہی تھی اور سائمن کے لئے کھڑے ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''اس طرف دیکھو گائے!'' سائمن اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ یہ دودھ کا جگ کس لئے ہوتا ہے۔ زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے کہ تم جانتی ہی نہیں کہ دودھ کیا ہوتا ہے۔ جلدی سے کھڑی ہو کر مجھے دودھ دے دو، وہاں سب لوگ ناشتے کے لئے انتظار کر رہے ہیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ مجھے ٹیچر سے ڈانٹ پڑے؟ جلدی کرو بھئی!''

گائے نے اس کی تقریر کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس نے اپنی دم زور سے گھمائی اور سائمن کی ٹانگوں پر ماری۔ ''ایسا مت کرو۔

سائمن نے کہا۔ ''کیا تم سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا گائے؟ میں کھڑے ہونے میں تمہاری مدد کروں گا۔'' اس نے گائے کو دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھی کی طرف ڈٹ کر لیٹی رہی۔ سائمن کے دھکے نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ سائمن ایک منٹ تک کھڑا اسے گھورتا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے اور پھر اس نے کسی کو جنگلے کے اوپر سے اسے آواز دیتے ہوئے سنا۔

''سائمن! جلدی دودھ لے کر آؤ! ہم انتظار کر رہے ہیں بھئی! سائمن بھاگ کر جنگلے کے پاس گیا۔'' گائے مجھے ذرا سا بھی دودھ نہیں دے رہی، بہت زیادہ ضدی ہے۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

''ارے احمق! تمہیں دودھ فارم پر سے ملے گا۔''

لڑکے نے جنگلے کے اوپر سے کہا: ''میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم اتنی دیر سے گائے کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ حد ہوگئی، لاؤ جگ مجھے دو، میں لے کر آتا ہوں'' وہ جنگلے سے کود کر اندر آیا، غریب سائمن سے جگ چھینا اور فارم کی جانب دوڑ گیا سائمن کی کلاس کے بچّوں کو جب پتہ چلا کہ وہ دودھ لینے کے لئے گائے سے بحث کر رہا تھا تو سائمن کا خوب مذاق اڑایا گیا۔

''خیر اب ہم تم سے کوئی کام نہیں لیں گے۔'' انہوں نے کہا: تم بہت احمق ہو سائمن! تم کبھی اپنے دماغ سے کام نہیں لیتے۔' بے چارہ سائمن! وہ بہت اداس تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ زیادہ سوچ نہیں سکتا تھا۔ اس کی ماں ہمیشہ اسے عقل سے کام لینے کی نصیحت کرتی تھی۔

اس واقعے کے بعد سے کسی نے بھی اسے مدد کے لئے نہیں کہا۔ اگر وہ مدد کرنے کے لئے خود کو پیش بھی کرتا تو بھی اسے اجازت نہیں ملتی تھی۔ کیمپ میں اگر

آپ کو کوئی کام نہ کرنے دیا جائے تو کیمپ جانا بیکار ہے غریب سائمن بے حد ناخوش تھا۔

''پلیز مجھے مدد کرنے دو۔'' اس نے جمی سے التجا کی جو لڑکوں کے لئے رات کا کھانا بنا رہا تھا۔ ''کیا میں آلو چھیل سکتا ہوں؟'' ''نہیں! پچھلی دفعہ جب تم نے آلو چھیلے تھے تو آدھے چھلکے اسی پر چھوڑ دیئے تھے۔ چلے جاؤ! میں سبزیوں کا سوپ بنا رہا ہوں۔ اور میں اس میں کوئی ادھ چھلی سبزی نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''تم اس میں کون کون سی سبزیاں ڈال رہے ہو؟ سائمن نے پوچھا۔

''گاجر، مولی، پیاز، شلجم.........'' جمی کہتے کہتے رک گیا۔

''اوہ! میرے پاس شلجم تو ہیں ہی نہیں۔'' مجھے اپنے لئے شلجم لانے دو۔ سائمن نے فوراً کہا۔

''تم شلجم اور کیلے میں فرق نہیں کر سکتے۔'' جمی نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

''جی نہیں! میں دونوں کا فرق جانتا ہوں۔ شلجم وہاں کھیت میں اُگتے ہیں ناں؟'' سائمن نے فخر سے کہا۔ ''ہاں!'' جمی نے کہا: اور سائمن نے کہا کہ ہمیں جتنے شلجموں کی ضرورت ہو ہم نکال سکتے ہیں۔ اچھا خیر ٹھیک ہے، تم میرے لئے کچھ شلجم لے کر آؤ اور خبردار جو تم پیاز اور گاجر لیکر آئے! سمجھے!! سائمن بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر چند منٹ بعد ہی واپس پلٹ آیا۔

''تمہیں کتنے شلجم چاہئیں؟ پندرہ یا بیس؟'' اس نے پوچھا۔ ''ارے نہیں بے وقوف! تین سے کام چل جائے گا۔'' جمی نے آلو چھیلتے ہوئے کہا۔ ''اب جاؤ بھی!'' سائمن چل پڑا۔ مگر ایک منٹ بعد ہی وہ پھر واپس پلٹ کر آیا۔

''تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمہیں کس سائز کے شلجم چاہئیں؟ بڑے یا چھوٹے؟''

"بڑے والے!" جمی نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "کتنے بڑے؟" سائمن نے پوچھا۔ اوہو! تمہارے سر جتنے بڑے! جمی چلایا۔ "اب چلے بھی جاؤ سائمن! ورنہ تم شام تک شلجم نہیں لاسکو گے۔" سائمن پھر چل پڑا۔ اس نے باڑ پھلانگی اور شلجم کے کھیت میں گھس گیا۔

"پتہ نہیں میرا سر کتنا بڑا ہوگا؟" سائمن نے اپنا سر چھو کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کیسے یہ فیصلہ کرسکتا ہوں کہ شلجم میرے سر کے برابر ہیں یا نہیں؟ میں اپنا سر نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی میں جانتا ہوں کہ میرا سر کتنا بڑا ہے؟" وہ واپس جا کر یہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سر کتنا بڑا ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ واپس جا کر پوچھے گا تو جمی بہت خفا ہوگا مگر وہ اس بات پر بھی تو کتنا خفا ہوگا اگر وہ بہت بڑے یا بہت چھوٹے شلجم لے کر گیا۔ اب یہ ایک معمہ تھا جسے حل کرنا سائمن کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔

"یقیناً کوئی ایسا طریقہ ہوگا جس سے مجھے معلوم ہوسکے کہ کون سے شلجم میرے سر کے برابر ہیں۔ مجھے اس پر غور کرنا چاہئے۔"

اس نے واقعی بہت غور کیا اور پھر وہ مسکرایا کیوں کہ اس نے یہ معمہ حل کرنے کی ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ "میرا ہیٹ میرے سر پر فٹ آتا ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا: "اب اگر میں صرف تین ایسے شلجم تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں جو میرے ہیٹ میں فٹ آجائیں تو وہ اتنے ہی بڑے ہوں گے جتنا میرا سر۔"

اس نے شلجم اکھاڑا اور اس کے اوپر اپنا ہیٹ رکھ دیا۔ پھر اس نے شلجم اٹھا کر دور پھینک دیا۔ "تم بہت چھوٹے ہو شلجم۔" اس نے کہا۔ "میرا ہیٹ تم پر فٹ نہیں آرہا۔" اس نے ایک اور شلجم کھینچ کر نکالا۔ یہ ایک بڑا شلجم تھا جو اسکے ہیٹ کے نیچے پورا نہیں سمایا۔ "تم بہت بڑے شلجم ہو۔ تم سے کام نہیں چلے گا۔" اور اس نے اسے بھی پھینک دیا۔ اس نے ایک اور شلجم کی پیمائش کی مگر وہ بھی بہت بڑا نکلا۔

پھر اسے ایک ایسا شلجم مل ہی گیا جو اس کے ہیٹ کے نیچے بالکل فٹ آیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ''اب دو اور چاہئیں۔'' اس نے خود سے کہا اور ایک کے بعد ایک شلجم اکھاڑتا ہی چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد اس نے بالآخر دو اور ایسے شلجم ڈھونڈ ہی لئے جو اس کے ہیٹ کے نیچے بالکل فٹ آئے۔ اس نے دو تین شلجم اپنی بغل میں دبائے، اپنا ہیٹ سر پر رکھا اور خوشی خوشی کیمپ کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

''اف توبہ! کتنی دیر لگا دی تم نے'' جمی اسے دیکھ کر چلایا۔ سائمن یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ جمی نے شلجموں کے سائز کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا جو بالکل اس کے سر کے سائز کے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھا۔ جب وہ رات کے کھانے پر دوسروں کے ساتھ بیٹھا تو اس نے ہر ایک کو الگ الگ بتایا۔ ''میں شلجم لے کر آیا۔ میں نے جمی کی مدد کی اور چونکہ میں نے اپنی عقل کا استعمال کیا۔ اس لئے میں نے آج کوئی احمقانہ حرکت نہیں کی۔''

لیکن چند لمحوں بعد ہی ایک لمبا چوڑا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا کیمپ کی طرف آیا۔ یہ کسان تھا اور بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

''شام بخیر جناب!'' اس نے سائمن کے اسکول ٹیچر سے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے لڑکوں میں سے کون تھا جس نے میرے کھیت کے آدھے سے زیادہ شلجم اکھاڑ کر پھینک دیئے اور اب وہ کھیت میں بکھرے پڑیں ہیں۔''

''ارے نہیں! وہ میرے لڑکوں میں سے کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔'' استاد نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ یہ سب بہت تمیز دار ہیں۔

معاف کیجئے گا جناب! مگر وہ آپ ہی کے لڑکوں میں سے کوئی ایک تھا۔ کسان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھا؟'' میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ میرے لڑکوں میں سے کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ استاد نے کہا۔ ''وہ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتے کہ شلجم توڑیں اور انہیں

کھیتوں میں پھینک کر آجائیں کہ وہ ضائع ہوتے رہیں۔'' یہ کہتے کہتے اچانک انکی نظر سائمن سے ٹکرائی جو چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

''سائمن سچ سچ بتاؤ۔ یہ بدتمیزی کی حرکت تمہاری تو نہیں ہے؟'' انہوں نے سختی سے پوچھا۔

اوہ''سر! جمی نے مجھے تین شلجم لینے کے لئے بھیجا تھا جو بالکل میر سر کے برابر ہوں۔'' سائمن نے روتے ہوئے کہا۔'' اور میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر کا سائز کیا ہے۔اسی لئے میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور تین ایسے شلجم ڈھونڈتا رہا جو اس کے نیچے فٹ آجائیں اور باقی میں نے دور پھینک دیئے کیونکہ وہ میرے کام کے نہیں تھے۔'' کیمپ میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور پھر قہقہوں کا ایک طوفان آ گیا۔ سائمن کو سنجیدگی کے ساتھ شلجموں کے اوپر ہیٹ فٹ کر کر کے دیکھنے کا تصور ہی کس قدر مضحکہ خیز تھا۔حتیٰ کہ کسان بھی مسکرانے لگا۔

''خیر! میرا خیال ہے کہ اس بچّے کا مقصد نقصان پہنچانا نہیں تھا مگر یہ بہر حال ایک احمقانہ حرکت تھی۔'' اس نے کہا اور سائمن کا منہ لٹک گیا، کیونکہ اس نے اپنے طور پر شلجموں کے کھیت میں اپنے دماغ کا بہترین استعمال کیا تھا۔

''میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا جناب کہ اس لڑکے کو میرے ساتھ بھیج دیں تا کہ یہ سارے ٹوٹے ہوئے شلجم سمیٹ کر میرے گودام تک پہنچائے۔

لٰہذا سائمن نے اگلا دن شلجم چن کر کھیت سے آدھا میل دور کسان کے گودام میں رکھنے میں گزرا۔ بے چارہ سائمن!! عقل کے استعمال کے لئے بھی عقل درکار ہوتی ہے۔ ●●●

دو بھائی

طاہر اختر میمن

ایک درویش ایک بار کہیں جانے کے لئے کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ اس کشتی میں اس درویش کے علاوہ ایک مالدار آدمی بھی سوار تھا۔ ان کی کشتی کے پیچھے ایک اور کشتی آ رہی تھی۔ اس دوسری کشتی میں چند مسافر سفر کر رہے تھے۔ جب مسافروں والی دوسری کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو گرداب میں پھنس کر اُلٹ گئی اور اس کے مسافر پانی میں غوطے کھانے لگے۔ غوطے کھانے والوں میں دو افراد سگے بھائی تھے۔

درویش کے ہم سفر مالدار شخص نے اپنی کشتی کے ملاح سے کہا۔
"بھائی! جلدی سے ان مسافروں کی مدد کرو۔ اگر تم نے ڈوبنے والوں کو بچالیا تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

اس ملاح نے انعام کا سنا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ فوراً ہی دریا میں کود کر دوسری کشتی کے مسافروں کی طرف لپکا جو غوطے کھا رہے تھے اور جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

چند منٹ کی جدوجہد کے بعد ملاح نے دونوں سگے بھائیوں میں سے ایک کو بچالیا جبکہ دوسرا ڈوب گیا۔ ملاح بچ جانے والے بھائی کو اپنی کشتی پر لے آیا۔

''دوسرے بے چارے کی عمر ختم ہو چکی تھی اس لئے اسے نکالنے میں تم سے دیر ہو گئی۔'' درویش نے ملاح سے کہا۔

''آپ کی بات سچ ہے۔'' ملاح نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن اسے بچانے کی میری اپنی نیت بھی نہیں تھی۔''

''آخر اس کی وجہ کیا ہے تم نے ایک کو بچالیا اور دوسرے کو ڈوبنے دیا۔ درویش نے پوچھا۔

ملاح کہنے لگا۔ ''بہت دن پہلے کی بات ہے .... ایک جنگل میں سفر کر رہا تھا چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد یہ دونوں بھائی ایک اونٹ پر سوار وہاں سے گزرے۔ اس بھائی نے مجھے تھکا ہوا دیکھ کر مجھ پر ترس کھایا اور اونٹ پر سوار کرالیا۔ لیکن اسکے بھائی نے مجھ سے جھگڑا کیا اور مجھے کوڑا مارا۔

اب میں نے اسے ڈوبتا دیکھا تو مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس وجہ سے اسے ڈوبنے دیا کہ اس نے مجھے خواہ مخواہ کوڑا مارا تھا۔ اور اس آدمی کو اس لئے بچالیا کہ اس نے بھائی کی مخالفت کے باوجود مجھے اونٹ پر سوار کرا کے مجھ پر احسان کیا تھا۔ یہ میرا محسن ہے۔''

اس ملاح کی بات سن کر درویش نے سوچا کہ انسان ایک نہ ایک دن اپنے کئے کی سزا ضرور پاتا ہے۔

''سبق: جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ کسی سے نیکی کرو گے تو کوئی تم سے بھی نیکی کرے گا''۔ آدمی جیسا عمل کرتا ہے اسے ویسا ہی پھل ملتا ہے۔

•••

رزقِ حلال

آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک ملک میں ایک خدا پرست، نیک دل اور نیک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بالکل سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ سرکاری خزانے سے ایک پیسہ لینا بھی حرام سمجھتا تھا اور اکثر بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھوما کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بھیس بدل کر محل سے نکلا۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ بادشاہ سوچ رہا تھا کہ محل کی طرف لوٹ جائے۔ اسی وقت بوندا باندی شروع ہوگئی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لئے ایک چھپر کے نیچے پناہ لے لی۔ یہ چھپر ایک عالی شان مکان کے نیچے واقع تھا۔ بادشاہ اس مکان کے مالک کو اچھی طرح جانتا تھا۔

بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔ اتنے میں اس مکان سے ایک آواز آئی ''کوئی مزدور ہے۔ کوئی مزدور ہے؟ پہلے تو بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا مگر دوسری آواز پر اس نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ''حاضر ہوں جناب'' بادشاہ چونکہ بھیس بدلے ہوئے تھا اس لئے مالک مکان اسے پہچان نہ سکا۔ وہ اسے اوپر والی منزل پر لے گیا اور چھت کی مرمت کے لئے کہا جو بارش کی وجہ سے خطرناک ہوگئی تھی۔ بادشاہ کمر باندھ کر مرمت کے کام میں لگ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنا کام

مکمل کر لیا اور مالک مکان سے اجازت طلب کی۔

مالک مکان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب میں اس وقت صرف ایک چونی ہی موجود تھی۔ اس نے چونی بادشاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس صرف ایک ہی چونی ہے۔ تم ایسا کرو کہ آج کی رات یہیں بسر کرو۔ صبح میں تمہیں انعام دے کر رخصت کروں گا۔''

بادشاہ نے انتہائی ادب سے عرض کیا کہ میرے بیوی بچے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اگر میں جلد واپس نہ گیا تو وہ بہت پریشان ہوں گے۔ آپ مجھے اجازت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔

مالک مکان نے الماری میں سے ایک کھاتہ نکالا اور اس کھاتے میں مزدوری کی رقم لکھ کر بادشاہ سے انگوٹھا لگوالیا۔

بادشاہ اپنی مزدوری لے کر اپنے محل کی طرف روانہ ہوا۔ محل میں پہنچ کر اس نے وہ چونی ایک طاق میں رکھ دی۔

کچھ دن کے بعد بادشاہ کا ایک پرانا دوست اس سے ملنے آیا وہ بہت ہی غریب آدمی تھا۔ وہ اپنی غربت کی وجہ سے اپنے دوست کے لئے زیادہ کچھ تو نہیں لا سکا تھا مگر تھوڑی سی کھجوریں اپنے ہمراہ بطور تحفہ لے آیا تھا۔

جب وہ محل میں داخل ہوا تو محل کی سجاوٹ اور خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس وقت اسے خیال آیا، بادشاہ کہیں یہ کھجوریں دیکھ کر اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ اسی فکر میں وہ بادشاہ کے سامنے پہنچ گیا۔

بادشاہ نے اپنے بچپن کے دوست کو دیکھا تو خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ جوں ہی اپنے دوست سے بغل گیر ہوا تو اس کا ہاتھ ان کھجوروں پر پڑا جو اس کے دوست کے کمر سے بندھی ہوئی تھی۔

بادشاہ نے محبت بھر لہجہ میں پوچھا ''دوست یہ کیا ہے؟''

دوست نے کہا ''آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں مگر میں جونہی محل میں پہنچا میرا خیال بدل گیا۔'' مہمان دوست نے اپنے دل کی ساری بات کہ ڈالی۔

یہ سن کر بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے دوست سے کہا۔ ''میرے پیارے تم نے یہ کیسے اندزہ لگایا کہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ میں تمہارا یہ تحفہ لینے کے لئے بے قرار ہوں۔ میرے لئے تو یہ ایک انمول تحفہ ہے۔''

مہمان دوست نے کھجوریں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر میں نے غلط انداز لگایا تھا۔''

''بھائی! میری زندگی بالکل سادہ ہے۔ میں سرکاری خزانے سے اپنے خرچ کے لئے کوڑی بھی نہیں لیتا۔'' یہ کہہ کر بادشاہ بڑے شوق سے کھجوریں کھانے لگا۔

چند روز گزرنے کے بعد بادشاہ کے دوست نے بادشاہ سے اجازت چاہی اور ساتھ ہی مالی امداد کی بھی درخواست کی۔ بادشاہ نے دوست سے پوچھا۔ ''تم میری کمائی سے لینا چاہتے ہو یا سرکاری خزانے سے؟''

دوست نے جواب دیا ''مجھے خزانے سے کیا مطلب، مجھے تو آپ اپنی کمائی میں سے دیں۔

بادشاہ اندر گیا اور وہی چونی اٹھا لایا جو چھت کی مرمت کی اجرت کے طور پر ملی تھی۔ یہ چونی اس نے دوست کو دے دی اور کہا ''یہ میں نے بڑی مشکل سے کمائی تھی۔ صرف یہی چونی تمام عمر میں جمع کر سکا ہوں۔ خدا اس سے تم کو برکت دے گا۔'' دوست نے بادشاہ سے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ چونی آپ کو اجرت میں ملی ہو؟''

بادشاہ نے کہا ''اگر تمہیں یقین نہیں تو ایک منٹ انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی فوراً ہی ایک غلام حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے غلام سے کہا ''فلاں محلے میں ایک امیر کے محل کے قریب آدمی کا گھر ہے اسے بلاؤ۔ غلام آداب کے بعد

اس شخص کو بلانے چلا گیا۔ جب غلام اس آدمی کے پاس پہنچا تو وہ بہت ڈرا کہ خدا خیر کرے، آج بادشاہ نے کیوں یاد فرمایا ہے۔

وہ دل ہی دل میں ڈرتا ہوا بادشاہ کے محل میں پہنچا اور آداب بجالایا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا ''تم نے اس سال اپنے مکان کی مرمت کرائی ہے یا نہیں؟''

اس آدمی نے ڈرتے ہوئے کہا ''جی ہاں حضور۔''

بادشاہ نے اس سے کہا ''تم اپنا بہی کھاتہ لے آؤ۔'' بہی کھاتہ اس رجسٹر کو کہتے ہیں جس میں حساب کتاب لکھا جاتا ہے۔

وہ شخص دوڑ کر گھر سے بہی کھاتہ اٹھالایا اور پڑھ کر سنانے لگا۔ جب اس چونی کا ذکر آیا بادشاہ نے پوچھا۔ ''یہ چونی تم نے کسے اور کیوں دی تھی؟'' اس نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا ''اچھا اب تم جا سکتے ہو۔'' پھر اس نے دوست سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ وہی چونی ہے اور وہ مزدور میں ہوں۔''

جب دوست کو تمام واقعہ معلوم ہوا تو اس نے چونی لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ آپ اپنے پاس رکھئے، مگر بادشاہ نے وہ چونی دوست کو دے دی اور بڑے پیار سے اس کو رخصت کیا۔

دوست تمام راستے یہی سوچتا رہا کہ آخر گھر جا کر وہ بیوی سے کیا کہے گا! آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ خالی ہاتھ گھر نہیں جانا چاہئے۔ میں کیوں نہ راستے سے ایک مچھلی خرید لوں۔

مچھلی خریدنے کے لئے وہ دریا کے قریب پہنچا تو دریا پر کافی مچھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک مچھیرے سے اس چونی کی ایک مچھلی خرید لی اور دریا پار کر کے اپنے گاؤں جا پہنچا۔

گھر جا کر اس نے بیوی سے کہا کہ بادشاہ نہیں ملا ورنہ وہ ضرور مدد کرتا وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ راستے سے میں یہ تازہ مچھلی لیتا آیا ہوں اسے جلدی سے

پکالو۔

بیوی نے خاوند سے کہا۔ ''میں نے آج بہت کام کیا ہے اس لئے تھک گئی ہوں۔ بہتر ہے آپ خود ہی مچھلی کو صاف کر لیں۔

آخر وہ خود ہی مچھلی صاف کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے چھری سے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو ایک بہت ہی چمک دار لعل مچھلی کے پیٹ سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ اس نے یہ لعل بیوی کو دیکھایا کہ یہ اس قدر چمک دار کیا چیز ہے؟

بیوی نے دیکھتے ہی فوراً اسے پہچان لیا کہ یہ ایک بہت ہی قیمتی اور نایاب لعل ہے۔ شوہر نے بیوی کے منہ سے لعل کا نام سنا تو مارے خوشی کے پاگل ہو گیا۔ اس نے لعل کو بہت زیادہ قیمت پر فروخت کر دیا۔

اس طرح اس کے پاس بہت سی دولت آ گئی۔ اب وہ بہت امیر ہو چکا تھا اور اس کا شمار امراء میں کیا جانے لگا تھا۔

ایک روز بادشاہ نے اپنے دوست سے اتنی جلدی امیر ہو جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے سارا واقعہ شروع سے آخر تک سنا دیا۔

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات سچ ہے کہ حلال کی روزی میں خدا ہمیشہ برکت دیتا ہے۔''

●●●

بھول

مرزا محمد شعیب

''ماں کے پاؤں تلے جنت ہے تو باپ جنت کا دروازہ۔'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے زندگی بھر اپنی ماں کی خدمت کی اور یہ بھول بیٹھا کہ باپ بھی جنت کا دروازہ ہے۔

وہ حیران و پریشان کھڑا تھا اس کے سامنے نہایت ہی دلکش منظر تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے باغات مختلف قسم کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت سرسبز پہاڑ، خوبصورت وادیاں اور دودھ کی نہریں وہ منظر اس کے سامنے حدنگاہ تک پھیلا ہوا تھا اس نے آج تک ایسا حسین منظر نہیں دیکھا تھا۔

وہ اس خوبصورت منظر میں کھو جانا چاہتا تھا اور درختوں پر لگے انواع اقسام کے پھل کھانا چاہتا تھا۔ نہروں میں بہتا دودھ پینا چاہتا تھا۔ پھولوں سے بھرے باغات میں ٹہلنا چاتا تھا لیکن اس کے درمیان ایک غیر مرئی دیوار حائل تھی۔ وہ جونہی آگے بڑھنے لگتا ایک دکھائی نہ دینے والی دیوار سے ٹکرا جاتا وہ دائیں بڑھنے لگتا ایک دکھائی نہ دینے والی دیوار سے ٹکرا جاتا وہ دائیں بائیں بڑی دور تک گیا لیکن کہیں سے بھی اسے اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ آخر کار وہ تھکاوٹ سے چور

ہو کر مایوسی کے عالم میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔

اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا اس کا باپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اس کی ماں بڑی شفیق عورت تھی۔ وہ اپنی ماں کی بڑی خدمت کرتا تھا اس نے کئی جگہ پڑھا تھا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ وہ اکثر اپنی ماں کے پاؤں دباتا اور ہر طرح سے اپنی ماں کا خیال رکھتا تھا کبھی کبھی تو وہ اپنی سوئی ماں کے قدموں کو چوم لیا کرتا تھا۔

لیکن اپنے باپ کے ساتھ اس کا رویہ کچھ ٹھیک نہ تھا اپنے باپ کی بات سنی ان سنی کر دیتا۔ اس کا باپ اگر کبھی زیادہ کام کی وجہ سے گھر دیر سے آتا تو اس کی ماں اسے کہتی کہ تمہارا باپ تھکا ہوا آیا ہے اس کی ٹانگیں دبا دو تو وہ کہتا کہ آج ہمارا میچ تھا اس لئے میں خود بہت تھکا ہوا ہوں۔ اسے شکوہ تھا کہ اس کا باپ اسے کہیں سیر کے لئے نہیں لے کر جاتا اس سے وقت نہیں دیتا حالانکہ اس کا باپ اس کے بہتر مستقبل کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرتا اور اکثر چھٹی کے دن بھی وہ کام پر چلا جاتا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بیمار بھی رہنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے باپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے ایک ادارے میں بہت اچھی ملازمت مل گئی اس نے ایک خوبصورت گھر بنوایا۔ شادی بھی ہوگئی۔ اس دوران اس کا باپ محنت و مشقت کی وجہ سے شدید بیمار ہو گیا۔ بیماری کے دوران اس نے اپنے باپ پر خاص توجہ نہ دی وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے کون سا میرا خیال رکھا۔

باپ کی وفات کے بعد وہ اپنی ماں کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔ اگر وہ بیمار ہوتی وہ ساری رات جاگ کر اس کی تیمارداری کرتا اس کی بیوی کا اگر اس کی ماں سے کبھی جھگڑا ہو جاتا تو وہ اپنی بیوی کو سخت برا بھلا کہتا۔ کبھی کبھار اس کی بیوی غصے میں اسے کچھ کہہ دیتی کہ ”آپ کا باپ بیماری میں عدم توجہ کی وجہ سے فوت

ہو گیا اس کا کبھی آپ نے خیال نہیں رکھا لیکن اپنی ماں کی دن رات خدمت کرتے رہتے ہو اور ہر صحیح غلط بات پر اسی کی طرفداری کرتے ہو۔"

اپنی بیوی کی ایسی باتیں سن کر وہ طیش میں آجاتا اور کہتا کہ "میرے باپ کو ساری زندگی صرف پیسہ کمانے کی فکر رہی میں بیمار ہوتا تو میری ماں ہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی اور ساری ساری رات میرے سرہانے بیٹھی رہتی۔ میرا باپ رات کو دیر سے آتا بس چند لمحے میرے پاس بیٹھ کر میرا حال پوچھتا اور جاکر سو جاتا اور صبح سویرے پھر کام پر چلا جاتا۔ اسے میری پرواہی کب تھی۔ میری ماں میری جنت ہے۔ میں اس کی خدمت کر کے جنت حاصل کر کے رہوں گا۔ میں اپنی ماں کے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

کبھی کبھی اس کی ماں بھی اسے سمجھاتی کہ "باپ دن رات تمہارے لئے اتنی محنت کرتا تھا۔ وہ تمہیں بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ وہ تمہیں اعلیٰ تعلیم دلانے اور ہر طرح کی آسائش فراہم کرنے کے لئے ہی تو دو شفٹوں میں کام کرتا تھا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس اس لئے نہیں لے جاتا تھا کہ چھٹی کی وجہ سے اس کی تنخواہ کٹ جاتی تھی لیکن یہ تو سوچو کہ تمہارے علاج پر اسی کا کمایا ہوا پیسہ خرچ ہوتا تھا۔ تمہاری خواہشوں پر اس نے اپنی ضرورتوں کو قربان کر رکھا تھا۔ اور تمہارے سنہرے مستقبل کے لئے اس نے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ آج تم جس مقام پر ہو یہ تمہارے باپ کی دن رات کی محنت کا ہی نتیجہ ہے۔" لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ کہتا کہ "آج میں جس مقام پر ہوں وہ میری محنت کا نتیجہ ہے اگر میں ذوق وشوق سے تعلیم حاصل نہ کرتا تو آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ البتہ تمہاری دعائیں ضرور میرے شامل حال تھیں میں آج جو کچھ بھی ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔ مجھے دنیا کی جنت بھی تمہاری وجہ سے ملی ہے اور آخرت کی جنت بھی تمہاری ہی وجہ سے ملے گی۔"

آج جنت اس کے سامنے تھی۔ وہ اسے دکھائی دے رہی تھی لیکن جنت کے اندر جانے کا کوئی راستہ اسے نہیں مل رہا تھا کیونکہ دُنیا میں وہ بات بھول گیا تھا کہ باپ جنت کا دروازہ ہے۔

●●●

فیصلہ

دو آدمی سفر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تین اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں۔ جب راستے میں بھوک لگی تو دونوں نے اپنی اپنی روٹیاں نکالیں۔ دونوں کی روٹیاں مل کر آٹھ ہوئیں۔ اتنے میں ایک مسافر اور آ گیا، جس کے پاس روٹیاں نہیں تھیں اس لئے دونوں نے کہا:

''آؤ بھائی! کھانا حاضر ہے۔''

اس طرح وہ بھی کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب ہر ایک روٹی کے تین ٹکڑے کئے گئے۔ اب تین روٹیوں کے نو ٹکڑے ہو گئے اور پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہو گئے۔ دونوں نے اپنی اپنی روٹیاں اکٹھا کیں تو چوبیس ٹکڑے ہوئے۔ اب تینوں مل کر کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمان نے آٹھ روپے دیئے اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ تم دونوں آپس میں بانٹ لینا۔ پانچ روٹی والے نے اپنے ساتھی سے کہا:۔

''میری روٹیاں پانچ تھیں اس لئے میں پانچ روپئے لوں گا اور تمہاری تین روٹیاں تھیں اس لئے تم تین روپئے لو گے۔''

تین روٹی والا بولا: ''ارے تین پانچ کی بات مت کرو۔ ہم دونوں نے مل کر

روٹیاں کھائی ہیں۔ اس لئے برابر حصہ ہوگا۔ چار روپے میں لوں گا اور چار روپے تم لوگے۔"

ان دونوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ پھر دونوں امیر المؤمنین کی بارگاہ میں گئے۔ آپ نے سارا واقعہ سن کر تین روٹیوں والے سے کہا:

"تم تین روپے لے لو۔ فائدے میں رہو گے۔"

مگر اس نے نہ سنا۔ پھر امیر المؤمنین نے حساب کر کے بتایا کہ تین روٹی والے کو ایک روپیہ ملے گا۔ اس لئے کہ تمہاری تین روٹیاں تھیں۔ ہر روٹی کے تین ٹکڑے کرو تو نو ٹکڑے ہوں گے۔ اس کی پانچ روٹیاں تھیں۔ اس کی روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہوئے۔ دونوں کو ملا کر چوبیس ٹکڑے ہوئے۔ اب کھانے والے تین ہیں۔ ہر ایک نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے۔ آٹھ تم کھا جاؤ گے، ایک حصہ مہمان کھا جائے گا۔ دس ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے کھا لئے۔ سات باقی بچّے جو مہمان نے کھائے۔ لہٰذا اس کے سات ٹکڑوں کے سات روپے ہوئے اور تمہارا ایک روپیہ ہوا۔ تین روٹیوں والا اپنا ایک روپیہ لے کر چپ چاپ چلا گیا۔

●●●

احساس

احمد اور رشید دونوں گہرے دوست تھے۔ امجد امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا جبکہ رشید ایک متوسط گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ امجد بہت ہی شرارتی تھا۔ ہر وقت نت نئی شرارتیں کرنے میں مگن رہتا۔ رشید اس کو منع کرتا لیکن امجد باز نہ آتا۔ ایک دن اسکول سے چھٹی کرنے کے بعد وہ دونوں اکٹھے اپنے اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ اچانک امجد بولا: ''ارے دیکھو چاچا مارو کی مرغیاں۔''

رشید نے کہا: ''تو پھر؟''

''تو پھر کیا، چلو ایک مرغی غائب کر لیتے ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا جب چاچا دیکھیں گے کہ ایک مرغی کم ہے۔ اور تم جانتے بھی ہو کہ چچا کتنا کنجوس ہے۔ جب ایک مرغی کم دیکھے گا تو اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔'' امجد نے کہا۔

''ارے نہیں یار، اس کام میں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا اور تم بھی حرکت سے باز آؤ تو بہتر ہے۔''

''ارے کچھ نہیں ہوگا یار۔'' امجد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جب

دیکھو صرف نصیحتیں کرتے رہتے ہو۔ اگر نہیں چلنا ہے تو مت چلو، میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شام کے وقت کسی نے ڈھنڈورا پیٹا کہ چاچا کی ایک مرغی چوری ہوگئی ہے۔ سارے محلے والے چاچا کے گرد جمع تھے۔ ساتھ ہی امجد اور رشید بھی کھڑے تھے۔

چاچا مارو چلا رہے تھے: ''ہائے میں مرگیا۔ میری مرغی، تین سو کی مرغی۔''

امجد چھپ چھپ کر ہنس رہا تھا اور اپنی حرکت کو انجام دے کر خوش ہو رہا تھا۔

دوسرے دن اسکول میں امجد نے لڑکوں کے ایک گروپ سے جھگڑا مول لیا اور رشید کو بھی اپنے ساتھ لڑنے پر مجبور کرتا رہا۔ رشید نے بہت منع کیا مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ امجد کے گروپ کو دوسرے گروپ کے لیڈر پرویز نے یہ دھمکی دی کہ چھٹی ہو جانے دو پھر دیکھ لیں گے۔

اسکول کی چھٹی کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ امجد کو پیچھے سے وہ لڑکا نظر آیا جس سے اس نے جھگڑا مول لیا تھا۔ وہ امجد کو خطرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ امجد رشید سے مخاطب ہوا: ''چلو یار، اس کو مزہ چکھاتے ہیں۔''

''نہیں امجد۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ تو تم سے نہیں لڑ رہا ہے۔''

''لیکن یار ہم لڑیں گے۔ وہ ایسے گھور گھور کے کیوں دیکھ رہا ہے؟''

یہ کہتے ہوئے امجد نے ایک پتھر اٹھایا اور اس کی طرف تیزی سے پھینکا۔ امجد کی دکھا دیکھی اس نے بھی پتھر اٹھائے اور برسانے شروع کر دیئے۔ اور اس طرح دونوں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ رشید امجد کو چلا چلا کر پتھر پھینکنے کو منع کر رہا تھا، پھر بھی اس نے توجہ نہ دی اور مسلسل پتھر پھینکتا گیا۔ رشید نے سوچا یہ تو باز آنے والا نہیں۔ چلو اسی لڑکے کو سمجھاتا ہوں۔

یہ سوچ کر وہ دوڑتا ہوا مخالف گروہ کے لڑکے کے پاس گیا۔ ابھی اس کے

منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا کہ ایک پتھر آیا اور اس کے سر کو خون سے لال کر گیا۔ غالباً یہ پتھر امجد ہی نے پھینکا تھا۔ لوگ رشید کو اسپتال لے گئے۔ رشید نے جب آنکھیں کھولیں تو اس کے ماں باپ کے ساتھ امجد بھی کھڑا تھا۔

''رشید مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔'' امجد نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں امجد، روتے نہیں۔ آج تو تم نے راہ راست اختیار کر کے مجھے خوش کر دیا اور تمہیں احساس ہو گیا ہو گا کہ میرا دوست مجھے سچ کہتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں گلے مل گئے۔

•••

سب سے بڑا امتحان

ہریش کمار منی

اللہ نے بخشی جنہیں تہذیب نظر
ملتے ہیں کم بہت ہی ایسے بشر
ہر بات میں پابند ادب رہتے ہیں
بے ہودہ گفتگو سے کرتے ہیں عذر
"کندن"

ایک دفعہ کی بات ہے کہ جنگل کے سارے جانور جنگل کے راجہ شیر کے پاس آ پہنچے اور انسان کی شکایت کی کہ انسانوں نے پورے جنگل میں تباہی مچائی ہوئی ہے۔ شکار کر رہے ہیں اور جنگل کاٹ رہے ہیں، اب ہم کہاں رہیں گے۔ غرض کہ ہر جانور نے انسان کی شکایت کی۔

راجہ شیر نے سرد آہ بھر کر کہا............ "لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟" اب تو پروردگار ہی بچائے۔ اس کی ہی بنائی ہوئی ہر شئے ہے۔ شاید پروردگار کو سب سے

زیادہ پیارا انسان ہی ہے۔ اس لئے انسانوں کا بول بالا ہے۔

اتنا ہی کہنا تھا کہ ایک آواز آئی...... نہیں پیارے شیر نہیں...... سارے جانور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کوئی نظر نہ آیا تو پوچھنے پر آواز آئی۔ ''ارے میں اس جگت کا پالنہار ہوں'' میرے لئے سبھی پیارے ہیں۔ میں جتنا پیار انسانوں سے کرتا ہوں اتنا ہی پیار جانوروں سے کرتا ہوں۔ تم انسان کی تباہی سے پریشان ہونا......؟

سارے جانور بولے...... ہاں مالک ہم انسانوں کی کرتوتوں سے پریشان ہیں۔ اس نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔

پھر آواز آئی...... انسان کو غرور ہو رہا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہی غرور انسان کو اپنی غلطی کا احساس دلائے گا۔ بس صرف تم میرا حکم بجالانا۔

''حکم آقا'' سارے جانور ایک ساتھ بولے۔

آواز آئی۔ تم ہمیشہ انسان کے ساتھ ہمدردی کرتے رہنا، جس طرح بھی ہو سکے انسان کی مدد کرنا۔ کسی انسان کو مصیبت میں دیکھ کر کسی طرح اس کی مدد کرنا اور یہ بات تو تم جانتے ہو جلدی کا کام شیطان کا۔ اس کام کے لئے وقت لگے گا۔ اب تم اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاؤ۔

کچھ دنوں بعد کی بات ہے کہ ایک کبوتر پانی پینے کی غرض سے دریا کے کنارے گیا تھا۔ اس نے اس دریا میں ایک کشتی کو دیکھا جو غرق آب ہو رہی تھی۔ فوراً اڑتا ہوا وہاں گیا، اس نے دیکھا ملاح کی پوری کوشش کے باوجود ملاح کے ہاتھوں کی طاقت نے جواب دے دیا اور سارے مسافر غرق آب ہو گئے۔

اس نے دیکھا کہ ایک بچہ ابھی زندہ ہے جو پانی میں تیر رہا ہے، بچہ بہت ہی چھوٹا تھا رو بھی رہا تھا۔

کبوتر اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر کیا کرتا۔ پھر اس کبوتر نے پروردگار کو یاد کیا

اور بولا...... میں کیسے آپ کا حکم بجالاؤں؟ میں کیا کروں؟ پھر خیال آیا میں اپنے کچھ پَر بچّے کے اوپر گرا دیتا ہوں اور کہا...... بچّے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر پکڑ لینا۔

بچّے نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر پکڑ لیا اور دریا کو اپنی ماں کا دامن سمجھ لیا کہ میں اب تمہارے حوالے ہوں۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ پروردگار نے اب ہوا کو حکم دیا کہ تم تیز ہو جاؤ اور اس ننھی جان کو پر کے ساتھ اُڑا کر کنارے پر لاؤ۔ پانی کو حکم ہوا تم اس کو ہوا کے حوالے کر دو، کیونکہ یہ بچّہ میں نے کسی کام کے لئے بنایا ہے۔

ہوا نے حکم بجالایا اور بچّے کو کبوتر کے پَر پر اُڑا کر کنارے لے آئی جیسے کاغذ پر قلم سے لکھا ہوا۔

مالک نے پتھر کو حکم دیا کہ تم نرم ہو جاؤ تاکہ اُس بچّے کو تکلیف نہ ہو۔ صبح کو حکم ہوا کہ تم اسے خوش رکھنا، گُلِ لالہ سے کہا کہ تم اس کے نزدیک اُگ جاؤ تاکہ اس کا دل بہل جائے۔ جنگل کے ہر ایک جانور کو حکم ہوا کہ تم کبھی بھی اس کو اپنا شکار مت بنانا اور کبھی بھی سارے جانور مل کر اس کے نزدیک مت جانا کیونکہ یہ ڈر جائے گا۔ دُکھ وغم کو حکم ہوا کہ یہ بچہ چھوٹا ہے صبر نہیں کر سکتا تم اس میں مت سمانا۔ قسمت کو حکم ہوا کہ اسے عقل اور بادشاہی دے۔ اندھیرے سے کو حکم ہوا کہ اسے روشنی دے تاکہ یہ کبھی ڈرے نہیں۔

غرض کہ پروردگار عالم نے اُسے اتنا آرام دیا کہ اُس بچّے کو آرام کا پتہ بھی نہیں چلا۔ وقت گزرتا گیا، بچّہ جوان ہوگیا، مگر ہر کسی کے غم سے انجان تھا۔ دُکھ درد غم ورنج کسی کے احساسات وخیالات کا ذرا بھی غم نہ تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ جیسے میں مست ہوں ویسے ہی ہر چیز ہے۔

ایک روز کی بات ہے کہ اس نے ایک شیر کو ایک کنویں میں گرتا دیکھا اور پھر

نزدیک جا کر دیکھا، شیر پانی میں مر رہا تھا مگر اسے موت کا بھی علم نہ تھا۔ اس نے ایک تماشہ سمجھا اور مزے لینے لگا۔ پھر اس کو اتنا مزا آیا کہ اس نے سوچا کہ میں بھی کنویں کھودوں گا اور مجھے جانوروں سے کھیلنے کا موقع ملے گا اور پھر وہ یہی کرنے لگا۔ وہ ہر روز جانوروں کو مارتا، جانور کنویں میں گرنے کے بعد اس سے مدد مانگتے مگر وہ تو مست تھا، اب جب جانور کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکے جان کی بھیک مانگتے دیکھ کر اسے یہ لگنے لگا میں بڑا ہوں اور یہ غرور بڑھتا گیا، اب جنگل کے سارے جانور پریشان ہوگئے، پھر ایک آواز آئی۔ میرے پیارے بے زبان جانوروں پریشان ہوگئے۔ پھر ایک ایک آواز آئی، میرے پیارے بے زبان جانوروں میں تم سے خوش ہوں تم نے میرا حکم مانا۔

اب تمہاری نسل کا پتہ لگے گا انسان کو کہ جانور کیا چیز ہے اور بڑا کون ہے؟ تم سارے جانور مل کر اس کے سامنے جاؤ اور اسے جنگ کے لئے للکارو۔

سارے جانور مالک حقیقی کا حکم پا کر اس کے سامنے آئے تو وہ حیران ہوگیا، اس نے اتنے جانوروں کو کبھی اکٹھا دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن جانوروں کی للکار پر بولا...... تم شیر مجھے چھو نہیں سکتے، کل تک مجھ سے بھیک مانگنے والے میرا کیا مقابلہ کریں گے۔ اس کو غرور تھا، تبھی ایک مچھر اڑتا ہوا آیا اس کے گال پر بیٹھا اور کاٹ لیا، وہ آدمی چلایا اور اپنے ہاتھ سے اپنے منہ پر زور سے تھپڑ مارا، مچھر اڑ گیا۔ سارے جانور ہنسنے لگے۔

شیر بولا ...... یہ تو ایک مچھر تھا، جس نے تم کو تمہاری اوقات بتا دی، مگر وہ عقل کا دشمن کیا جانتا پھر بھی ان سے مقابلہ کرنا چاہا اور اپنے کو بڑا کیا۔ مچھر نے اسے بار بار کاٹا اور وہ بار بار خود اپنے آپ کو مارتا۔ اس کو پہلی بار ڈر لگا، جانوروں کی دہاڑ سن کر بھاگ گیا، اب جانور اس کے پیچھے لگے۔ وہ جان بچانے کے لئے ایک غار میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ غار کے منہ پر ایک مکڑا جال بن رہا ہے اور

مکڑے نے جال پورے منہ پر تان ڈالا، جانور یہاں آپہنچے، غار کو دیکھ کر بولے شاید اس غار میں نہیں ہوگا۔

آدمی کو اپنی اوقات کا پتہ لگا کہ میں کتنا چھوٹا ہوں۔ مجھے کسی نے آج تک چھوا نہیں اور ایک چھوٹے مچھر نے کیا بنا ڈالا۔ ایک چھوٹے سے مکڑے کے جال نے مجھے بچایا۔ میں غلط تھا، سب سے بڑا پروردگار ہے اور یہ جانور چھوٹا اتنا کار آمد ہے تو بڑا کتنا ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے شکار کرنے سے توبہ کرلیتا ہے۔

●●●

دُنیا کی مثال

فرحیہ ثمائم

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کہیں جارہا تھا ایک شیر اس کے پیچھے بھاگا۔ اس کے قریب کوئی بھی درخت نہیں تھا۔ جس پر چڑھ جاتا اسے ایک کنوان نظر آیا۔ اس نے سوچا میں کنویں میں چھلانک لگا دیتا ہوں جب شر چلا جائے گا میں کنویں سے نکل آؤں گا۔ جب اس نے چھلانگ لگانے کے لئے جھانک کر دیکھا تو کنویں میں پانی کے اوپر ایک کالا ناگ تیرتا ہوا نظر آیا۔ اب پیچھے شیر تھا اور نیچے کنویں میں کالا ناگ تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہوکر سوچنے لگا اب میں کیا کروں؟ اسے کنویں کی دیوار پر کچھ گھاس اُگی ہوئی نظر آئی اس نے سوچا میں اس گھاس کو پکڑ کر لٹک جاتا ہوں نہ اوپر رہوں گا کہ شیر کھا جائے نہ نیچے رہوں گا کہ سانپ ڈسے میں درمیان میں لٹک جاتا ہوں جب شیر چلا جائے گا تو میں بھی باہر نکل آؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ ایک کالا اور سفید چوہا دونوں اسی گھاس کو کاٹ رہے ہیں۔ جس گھاس کو وہ پکڑ کر لٹک رہا تھا اب اسے اور زیادہ

پریشانی ہوئی اس پریشانی کے عالم میں جب اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو قریب ہی اسے ایک شہد کا چھتا نظر آیا۔ اس پر مکھیاں تو نہیں تھیں مگر وہ شہد سے بھرا ہوا تھا چھتہ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ ذرا دیکھوں میں اس میں کیسا شہد ہے۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ سے گھاس کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی پر جب شہد لگا کر چھکا تو اسے بڑا مزہ آیا۔ اب وہ اسے چاٹنے میں مشغول ہو گیا نہ اسے شیر یاد رہا نہ ناگ یاد رہا اور نہ ہی اسے چوہے یاد رہے سوچیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ مثال دینے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''اے دوست! تیری مثال اسی انسان کی سی ہے ملک الموت شیر کی مانند تیرے پیچھے لگا ہوا ہے قبر کا عذاب اس سانپ کی صورت میں تیرے انتظار میں ہے۔

کالا اور سفید چوہا یہ تیری زندگی کے دن اور رات ہیں۔

گھاس تیری زندگی ہے جسے چوہے کھا رہے ہیں اور یہ شہد کا چھتہ دُنیا کی لذتیں ہیں جن سے لطف اندوز ہونے میں تو لگا ہے تجھے کچھ یاد نہیں۔ سوچ کہ تیرا انجام کیا ہوگا۔

واقعی بات یہی ہے کہ انسان دنیا کی لذتوں میں پھنس کر اپنے رب کو ناراض کر لیتا ہے۔ کوئی کھانے پینے کی لذتوں میں پھنسا ہے اور کوئی اچھے عہدے اور شہرت کی لذت میں پھنسا ہوا ہے یہی لذتیں انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہیں۔ اس لئے جہاں ترک دُنیا کا لفظ آئے گا اس سے مراد ترک لذت ہوگا۔

●●●

(ا)

دو دوست جنگل کے راستے سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک ریچھ آتا دکھائی دیا۔ ایک دوست نہایت پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرے کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ دوسرے نے پہلے کو مدد کی لئے پکارا۔ پہلا اور اوپر چڑھ گیا۔ تب دوسرے کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ جھٹ سے پیڑ کی جڑ کے پاس لیٹ گیا اور سانس روک لی۔ ریچھ نے آکر اس کے منہ، ناک اور کان کو سونگھا اور مردہ سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد پہلا دوست درخت سے نیچے آترا اور دوسرے سے بولا: ''ریچھ تمہاری کان میں کیا کہہ رہا تھا؟''۔ دوسرے دوست نے جواب دیا: وہ کہہ رہا تھا کہ'' خود غرض لوگوں کی دوستی پر بھروسہ منت کرنا''۔

(۲)

ایک شخص دن کے اُجالے میں شمع کرلے کر بازار میں چکّر لگا رہا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا: ''دن کی شروتی میں چراغ لے کر کسے ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟''۔ اس نے جواب دیا ''میں آدمی کی تلاش میں ہوں مگر وہ نہیں ملتا''۔ اُس شخص نے یہ سن کر کہا:

''جناب بازار میں تو اتنے آدمی ہیں کہ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے''۔ اس نے کہا: ''میں ایسے آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو غصّے اور لالچ کے موقع پر بھی اپنے آپ پر قابو رکھے''۔

اس شخص نے کہا: ایسا آدمی تو کم ملتا ہے''۔

اس نے کہا: ''مگر مجھے ایسے ہی آدمی کی تلاش ہے''۔

(۳)

میں نے کبھی قسمت کی خرابی یا آسمان کی سختی کی شکایت نہیں کی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ننگے پاؤں تھا اور جوتا بھی نہ خرید سکتا تھا۔ اسی غم میں میں کوفہ کی مسجد میں داخل ہوا۔ وہاں میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ میں نے خدا کی نعمت کا شکر ادا کیا اور اپنے پاس جوتا نہ ہونے پر صبر کیا۔

•••

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

بلال احد قادری

ابتدائی حالات: آپ کا نام خواجہ معین الدین حسن ہے۔ چشت موضع شہنہ گاؤں میں سکونت کی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ چشتی منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا نام غیاث الدین اور والدہ کا نام بی بی اُمِ نورع تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی آپ کے والد بزرگوار ایک بڑے عالم تھے۔ خواجہ صاحب نے نو سال کی عمر قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد سنجر کے ایک مکتب میں ابتدائی طور سے تغیر فقر اور حدیث کی تعلیم پائی اور کچھ ہی عرصہ میں آپ نے خاصہ علم حاصل کرلیا۔ ابھی آپ کی عمر ۱۴ سال تھی کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب کے انتقال کے چند ہی مہینے بعد والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا اُس وقت آپ کی عمر صرف پندرہ سال تھی اس کمسنی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن آپ نے صبر کیا ذریعہ معاش میں صرف ایک باغ اور ایک پن چکی تھی پھر آپ خود پودھوں کی دیکھ بھال کرتے تھے ان کو پانی دینے

اور کاٹ چھانٹ کرتے۔ غرض کہ ہر ممکن طریقے سے درختوں، پودھوں بیلوں اور باغ کی نگرانی کرتے اور یہی آپ کا ذریعہ معاش تھا۔

تعلیم: تاتاریوں نے خراسان کے اکثر وپیشتر مدارس دینیہ کو نیست ونعبود کردیا۔ اس لئے خواجہ صاحب کو علم حاصل کرنے کے لئے دور دراز کا سفر کرنا پڑا۔ دشوار گزار راستوں، سحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں ارو گھنے جنگلوں کو طے کرتے ہوئے اور ہر قسم کے مصائب وتکالیف برداشت کرتے ہوئے آپ برابر سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بخارا کے مشہور مدارس میں پہنچ کر آپ نے فقراحدیث، تفسیر اور دوسرے عقل علوم کی کتابیں پڑھیں اور مولانا حسام الدین بخاری جیسی ہستیوں اور دوسرے علماء سے آپ نے علم حاصل کیا آخر کار مولانا حسام الدین بخاریؒ نے آپ کو دستار فضیلت عطا کی او علم دین سے اتنا مالا مال کیا کہ آپ کا شمار اُس وقت کے مشہور علماء میں ہونے لگا پھر بھی علم کی پیاس باقی رہی اور آپ مولانا حسام الدین بخاریؒ سے رخصت ہوکر سمرقند چلے گئے۔ سمرقند میں پہنچ کر مزید علم حاصل کیا۔

پیرومرشد کی تلاش

آپ مرشد کی تلاش میں عراق تشریف لے گئے۔ جب آپ قصبہ ہارون جونیشار پور کے نوح میں ہے پہنچے تو حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے آپ کو فرقہ خلافت دے کر رخصت کردیا۔ خواجہ صاحب انیس الارواح میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کی زیارت کے لئے میں بغداد پہنچا اور کئی سال آپ کی خدمت میں رہ کر ظاہری اور باطنی سفر طے کئے۔ بعد فرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔ وہاں سے آپ قصبہ بخان میں تشریف لائے اس وقت شیخ نجم الدین

کبریٰ قدس سرہ بغداد میں ابتدائی سلوک طے کر رہے تھے خواجہ صاحب نے ان کے حق میں دعا کی اور فرقہ خلافت عطا فرمایا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے بھی ابتدائی حال میں آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے خواجہ صاحب کے ملفوظات میں اکثر جگہ لکھا ہے۔ کہ شیخ خباب شہاب الدین سروردی اور شیخ اوحد کرمانی ڈھائی مہینے آپ کی خدمت میں رہے۔ وہیں سے خواجہ صاحب قصبہ جہاں تشریف لے گئے جو بغداد سے سات دن کے راستے پر کوہ جودی کے دامن میں واقع ہے۔ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ اُس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے۔ آپ پانچ ماہ اور سات دن ان کی صحبت میں رہے اور دونوں حضرات کے درمیان راز و نیاز کی مجالس گرم رہیں۔ وہاں سے آپ بغداد تشریف لے گئے اور شیخ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ کی صحبت میں بہت محفوظ ہوئے۔ شیخ اوحد کرمانی اس وقت ابتدائے سلوک میں تھے۔ خواجہ بزرگ نے ان کے حق میں بھی توجہ فرمائی اور فرقہ خلافت عطا فرمایا۔ آپ بغداد سے چل کر ہمدان پہنچے۔ وہاں شیخ یوسف ہمدانی جو اس وقت کے بڑے بزرگ تھے کی صحبت حاصل ہوئی۔ اور آپ تبریز تشریف لے گئے اور شیخ ابوسعید تبریزی جو بڑے عارف کامل مجرد اور متوکل تھے کی صحبت حاصل کی۔ سلطان الشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ ابوسعید کے شیخ جلا الدین تبریزی کی طرح ستر (۷۰) مرید تھے۔

خواجہ صاحب اللہ کے دربار میں ضرت خواجہ غریب نواز ۵۸۳ ہجری میں مکہ معظمہ پہنچے اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اکثر طواف کعبہ کرتے اور عبادت میں مشغول رہتے۔ اپنے وہاں بے شمار سعادتیں اور برکتیں حاصل کیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ خانہ کعبہ میں عبادت میں مشغول تھے، غیب سے آواز آئی۔

اے معین الدین میں تجھ سے راضی ہو، تجھے بخش دیا، جو کچھ تیرا دل چاہے مانگ لے۔ خواجہ غریب نواز سن کر بہت خوش ہوئے اور بے خود ہو کر سجدے میں گر پڑے۔ آپ نے بارگاہ ایزدی میں نہایت عاجزی وانکساری سے عرض کیا۔ خداوند تعالیٰ جو میرے سلسلے میں مرید ہوں ان کو بخش دے۔ اُس وقت ندا آئی۔ اے معین الدین......! تیری دعا مقبول ہوئی ہے اور قیامت تک تیرے سلسلے میں جو داخل ہوگا۔ اسے بخش دوں گا۔

خواجہ صاحبؒ رسول اللہ کے دربار میں

مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ مدینہ منورہ آئے اور بکمال بخسر و نیاز دربارِ رسالت مآب میں حاضری دی۔ ایک روز صبح نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد تمام مسجد نبویؐ کے نمازی روضہ اقدس کے قریب وجوار میں صلوٰۃ سلام پڑھ کر ادب واحترام سے رخصت ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک آواز آئی۔ معین الدین کو بلاؤ۔

شیخ الروضہ نے محراب مسجد میں کھڑے ہو کر آواز دی ''معین الدین حاضر ہوں'' اُس مجمع میں جس قدر معین الدین نام کے افراد موجود تھے۔ شیخ الروضہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے۔ اب شیخ الروضہ حیران ہیں کہ کس معین الدین کو سرکار نے بلایا ہے۔ چنانچہ دریافت کرنے پر حضورؐ نے فرمایا: معین الدین چشتی کو حاضر کرو۔ خواجہ معین الدین چشتی کو حاضر کرو۔ خواجہ معین الدین چشتی لبیک کہتے ہوئے شیخ الروضہ کے قریب پہنچ گئے۔ شیخ الروضہ نے آپ کو روضہ اقدس پہنچایا اور عرض کیا...... یا رسول اللہ......! معین الدین چشتی حاضر ہیں۔

روضہ اقدس کا دروازہ بخود کھل گیا، اور ارشادِ نبوی ہوا ''اے قطب المشائخ

اندر آؤ۔'' حضور خواجہ غریب نواز عالم وجدانی میں روضہ اقدس کے اندر داخل ہوئے۔ اور تجلیات نبوی علم سے بے خود سرشار ہو گئے۔ جب طمانیت قلب حاصل ہوئی حکم ہوا.......... ''اے معین الدین......! تو ہمارے دین کا معین ہے ہم نے ولایت تجھے عطا کی۔ ہندوستان جا اور اجمیر میں قیام کرو وہیں سے تبلیغ اسلام کرنا۔ خدا تجھے برکت عطا فرمائے گا۔ خواجہ غریب نواز روضہ اقدس سے باہر نکلے اور آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔

خواجہ صاحب ہندوستان میں

آپ پرتھوی راج چوہاں کے دورِ حکومت میں اجمیر ہندوستان تشریف لائے اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ پرتھوی راج چوہان اُسی زمانے میں اجمیر میں مقیم تھا۔ ایک دن اس نے آپ کے ایک مسلمان عقیدت مند کو بتایا، وہ بیچارہ آپ کے پاس فریاد لیکر پہنچا، آپ نے اس کی سفارش میں پرتھوی راج چوہان کے پاس ایک پیغام بھیجا۔ لیکن اس نے آپ کی سفارش قبول نہ کی اور کہنے لگا کہ یہ شخص یہاں آکر بدل گیا ہے اور غیب کی باتیں کرتا ہے۔

جب خواجہ اجمیری کو یہ بات معلوم ہوئی تو ارشاد فرمایا: ہم نے پھتوں کو زندہ گرفتار کر کے حوالے کر دیا اُس زمانے میں سلطان معز الدین عرف شہاب الدین غوری کی فوج غزنی سے پہنچی، پتھورا لشکر اسلام سے مقابلہ کے لئے آیا اور سلطان معز الدین کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس تاریخ سے اس ملک میں اسلام پھیلا۔

جوگی جے پال کا ایمان لانا

اجمیر میں اسلام کے فروغ سے رائے پتھورا کو بڑی تشویش ہو گئی چنانچہ

اس نے حضور غریب نواز کے مقابلے کے لئے اپنے خاندانی گرو کی طرف رجوع کیا۔ جس کا نام جے پال جوگی تھا۔ جے پال ہندوستان کا سب سے بڑا اور صاحب کمال جادوگر تھا۔ جو اجمیر کے قریب ہی جنگل میں رہتا تھا۔ راجہ نے اسے بلا کر تمام احوال خواجہ کا سنایا۔ جوگی نے حضور کے معمولی کرامات کو شعبدہ بازی اور ساحرانہ کیفیت سمجھا۔ اُس نے راجہ کو یقین دلایا کہ اس فقیر کو یہاں سے نکال دوں گا۔ چنانچہ مرگ چھالا پر بیٹھا اور اپنے تمام چیلوں کو ساتھ لیکر انا ساگر کی طرف روانہ ہوا جہاں سرکار غریب نواز قیام پذیر تھے۔ شیاطین کا یہ لشکر اڑن شیروں پر سوار ہاتھوں میں اژدھوں کے کوڑے لئے ہوئے وحشیانہ طور پر چیختے چلاتے انا ساگر کے کنارے آجما۔ حضور غریب نوازؒ کے رفقا اس شیطانی لشکر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ اُس وقت آپ نے اپنی انگلی سے حصار کھینچ دیا اور فرمایا۔ اس کے باہر نہ جانا محفوظ ہو گئے۔ جے پال اور اس کے چیلوں نے اپنے ہاتھوں سے جادو کے اژدہے چھوڑ دیئے اس ترکیب کے ناکام ہونے سے جادوگروں نے آگ برسانی شروع کردی مگر اس آگ نے بھی سرکار اور آپ کے ساتھیوں پر کوئی اثر نہیں کیا بلکہ وہ آگ لوٹ گئی اور اس سے جادوگر ہی جل کر خاک ہونے لگے۔ جب ان کا کوئی کرتب کارگر نہ ہوا تو اجے پال نے یہ طے کیا کہ آسمان پر پہنچ کر وار کیا جائے۔ چنانچہ وہ آسمان کی طرف اڑنے لگا تاکہ فضا سے حملہ آور ہو۔ جب حضرت غریب نوازؒ کی نظر اس پر پڑی تو آپ نے اپنی جوتیوں کو اشارہ کیا کہ اس بے دین کو نیچے اتار لائیں۔

جوتیاں اُڑیں اور آن کی آن میں اجے پال کے سر پر پڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہ جوتیاں جے پال کے سر پر مسلط ہیں۔ اور وہ چارو ناچار نیچے اترتا چلا آرہا ہے۔ آخر غرور کا سر نیچا ہوا۔ اجے پال کی آنکھوں سے اب پردے ہٹ چکے تھے اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ آج تک سحر کے ھتوں میں زندگی برباد کی لہٰذا آنکھوں میں اشک ندامت بھر لایا اور معافی کا خواستگار ہوا۔

خواجہ صاحبؒ نے کمال مہربانی سے معاف کردیا اور وہ صدق دل سے مسلمان ہوگیا۔ حضرت نے اس کا نام عبداللہ تجویز فرمایا اوراس کے چیلے بھی ایمان لے آئے اور چند افراد نے کفار پر یہ واقعہ دیکھا تھا وہ سب حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔

شادیاں اور اولادیں

حضرت خواجہ غریب نواز کی عمر تقریباً ۸۹ سال کی ہوگی اور اجمیر شریف آپ کا معمول قیام گاہ بن گیا۔ نیز تبلیغ کا کام کمال عروج کو پہنچ گیا۔ تو ایک روز خواب میں آپ کو حضور سرکارِ دوعالم کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا:

اے معین الدین تم نے احکام خداوندی کی بجا آوری میں سرگرم کوششیں کی۔ کیا وجہ ہے کہ میری سنت پر عمل نہیں کیا'' چنانچہ اس خواب کے بعد حضرت خواجہ غریب نواز نے یکے بعد دیگر دو نکاح کئے۔ اور دونوں اجمیر شریف میں ایک باخدا بزرگ سید وجیہہ الدین مشہودیؒ جو اجمیر شریف میں مقیم تھے۔ انہوں نے ایک روز امام جعفر صادق کو خواب میں دیکھا، فرما رہے ہیں۔ اے فرزند وجیہہ الدین ارشاد حضور سرور عالم ہے کہ اپنی لڑکی خواجہ معین الدین کے نکاح میں دیدو کیونکہ وہ واسلان درگاہِ الٰہی و جہانِ رسالت پناہی میں سے ہے۔ جس وقت سید صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو ان کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ حضور خواجہ غریب نوازؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا خواب بیان کیا۔ خواجہ بزرگ نے فرمایا: کہ اگرچہ میری عمر آخر ہوئی اور اب نکاح کی ضرورت نہیں تاہم حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تکمیل اور فرمانِ امام عالی مقام کا بجالانا ضروری ہے۔ اس لئے یہ تقریب مجھے منظور ہے۔

یہ سن کر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور حضرت غریب نواز کے ساتھ اپنی

دختر نیک اختر کا نکاح کر دیا ان بی بی صاحبہ کا نام بی بی عصمت تھا۔
حضور غریب نواز نے عقد ثانی عقد کیا ہے ۔ دونوں بیویوں سے تین صاجبزادے اور ایک صاجبزادی جملہ چار اولادیں ہوئی۔
جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں
حضرت خواجہ فخر الدینؒ، حضرت خواجہ حسام الدینؒ، حضرت خواجہ ضیاء الدین ابوسعیدؒ اور بی بی حافظ جہاںؒ۔

وصال خواجہ

633ہجری شروع ہوتے ہیں خواجہ غریب نواز کو علم ہوگیا کہ یہ آخری سال ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے مریدوں کو ضروری ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں۔
جو لوگوں کو خلافت دینی تھی ان کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ 633ہجری میں 5اور 6رجب کی درمیانی شب کو جب معمول عشاء کی نماز کے بعد آپ اپنے ہجرے میں داخل ہوئے اور اندر سے دروازہ بند کر کے یادِ خدا میں مشغول ہو گئے ۔ رات بھر درود اور ذکر کی آواز آتی رہی صبح ہونے سے پہلے یہ آواز بند ہوگئی۔ سورج نکلنے کے بعد بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو خدام نے دستکیں دیں۔ اس پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو پریشانی بڑھ گئی۔ آخر مجبوراً دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ آپ وصال بحق ہو چکے ہیں۔
آپ کے بڑے صاجبزادے خواجہ سید فخر الدینؒ نے نماز جنازہ پڑھائی ، جس حجرے میں آپ نے انتقال فرمایا تھا اس حجرے میں آپ کو دفن کیا گیا۔ تب ہی سے آپ کا آستانہ مبارک تمام ہندوستان کا روحانی مرکز بنا ہوا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بنا رہے گا۔

خواجہ غریب نوازؒ کی کرامات

ایک روز خواجہ غریب نوازؒ اناساگر کے قریب تشریف فرما تھے۔ اُس طرف سے چرواہا گائے کے چند بچّوں کو چراتا ہوا نکلا۔ آپ نے فرمایا: بیٹا......! مجھے تھوڑا دودھ پلا دے۔ اُس نے خواجہ صاحبؒ کے فرمان کو مذاق سمجھا اور عرض کیا۔ بابا یہ تو ابھی بچّے ہیں ان میں دودھ کہاں......؟

آپ نے مسکرا کر ایک بچھیا کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: بھائی......! اس کا دودھ پیوں گا۔ دودھ لا۔

وہ ہنسنے لگا۔ آپ نے دوبارہ ارشاد فرمایا: برتن لے جا تو سہی، وہ حیران ہو کر بچھیا کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بچھیا کے تھن جو پہلے برائے نام تھے اور اب اس کے تھنوں میں کافی دودھ بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے کئی برتن بھر کر دودھ نکالا جس سے چالیس آدمی سیراب ہو گئے ۔ یہ دیکھ کر وہ چرواہا قدموں میں گر پڑا اور غلام میں داخل ہو گیا۔

حضور خواجہ غریب نوازؒ کے ارشاداتِ عالیہ

۱۔ فقیری کا مستحق وہ شخص ہوتا ہے جو عالم فانی میں اپنے پاس کچھ نہ رکھے۔

۲۔ خدا کی شناخت اس شخص کو ہوگی جو غفلت سے علیحدہ رہے اور خود کو عارف نہ سمجھے۔

۳۔ خاموش اور مغموم رہنا عارفوں کی ایک علامت ہے۔

۴۔ تمام عالم اور کائنات عالم کو اپنی دو انگلیوں میں دیکھنا عرفان کا ایک درجہ ہے۔

۵۔ نماز مومنین کی معراج ہے اس کی حفاظت کامل طور پر کرنی چاہئے۔

۶۔ جو شخص فجر کی نماز پڑھ کر طلوع آفتاب تک اسی جگہ بیٹھا رہے اور نمازِ عشراق

پڑھ کر اٹھے تو حق تعالیٰ اسے مصر ستر ہزار آدمیوں کے جو اس کے اہل ہوں بخش دیتا ہے۔

۷۔ محبت کے چار درجے ہیں۔(۱)۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔(۲) ذکر الٰہی بدرجہ الم کرنا اور اس کے ذکر میں خوش وخرم رہنا۔(۳) وہ اذکار و شغال اختیار کرنا جو دنیاوی محبت کے مانع ہوں۔(۴) ہمیشہ روتے رہنا۔

۸۔ حاجت روائی کے واسطے سورۂ فاتحہ پڑھنا بے حد مفید ہوتا ہے۔

۹۔ نیک کام کرنے سے بہتر نیکوں کی صحبت اور برے کام کرنے سے بدتر بروں کی صحبت ہے۔

●●●

شہیدِ وطن اشفاق اللہ خاں

محمد الیاس

کسی بھی قوم کے عروج وزوال میں اس کے نوجوانوں کا اہم رول ہوتا ہے۔قوم کے نوجوان جس قماش (Quality) کے ہوں گے، قوم بھی ویسی ہی ہوگی۔ اشفاق اللہ خاں ہماری قوم کے ان نوجوانوں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے جان کی قربانی دے کر آزادی کی مشعل کو روشن کیا۔ 22/اکتوبر 1900ء کو شاہجہاں پور کے ایک امیر اور خوشحال خاندان میں پیدا ہونے والے اس لڑکے کی مرادیں اور اُمنگیں عام نوجوانوں کی اُمنگوں اور مرادوں سے مختلف تھیں۔اپنے خاندان کے چہیتے اور لاڈلے اشفاق نے پندرہ برس کی عمر میں انڈین ری پبلکن ایسوسی ایشن جوائن کرلی۔اور ملک ووطن کی آزادی کے تصور سے ہی ساری زندگی عشق کیا۔

جلیانوالہ باغ کا دلدوز سانحہ اُن کے سامنے تھا، چنانچہ اُن کا دردمند دِل اور حساس ضمیر اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ اپنی نوجوانی کو بے کار اور فضول کی باتوں میں گنوائیں۔انہیں جلد ہی ایک ایسا ساتھی بھی مل گیا جس نے ان کی تمناؤں اور آرزوں کو صحیح سمت دِکھائی۔ رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ کے دوست بھی تھے اور رہنما بھی۔ دونوں نے ہی اپنے دیگر ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ

وطن کی آزادی کے لئے جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

9 راگست 1925ء تاریخ آزادی کا وہ یادگار دِن ہے، جب اشفاق اللہ خان، پنڈت رام پرساد بسمل اور اُن کے دیگر آٹھ ساتھیوں نے ریل پر جارہے سرکاری خزانے کولوٹنے کا منصوبہ بنایا تا کہ اس رقم سے اپنی تحریک کے لئے سرمایہ فراہم کرسکیں۔ پروگرام کے مطابق وہ لوگ 8 ڈاؤن پسنجر ٹرین میں سوار ہوکر لکھنؤ کیلئے روانہ ہوئے۔ ان کے پاس ضروری سامان ہتھوڑا، چھینی اور کلہاڑی بھی تھے ۔ سبھوں کو اپنی ذمہ داریاں بخوبی یاد تھیں، چنانچہ ریل جونہی کاکوری اسٹیشن کے قریب پہنچی، زنجیر کھینچ دی گئی اور جب ٹرین رُک گئی تو گارڈ معاملے کو سمجھنے کیلئے نیچے اُترا اور پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق گارڈ کو پستول دکھا کر زمین پر منہ کے بل لیٹ جانے پر مجبور کردیا گیا۔ ایک نوجوان نے بریک وَین میں چڑھ کر خزانے سے بھرے صندوق کو نیچے گرادیا۔ یہ سارا کام بسمل کی رہنمائی میں انجام پارہا تھا۔ اشفاق اللہ نے ہتھوڑوں کی ضرب سے صندوق میں بڑا سوراخ کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا۔ اس ساری کارروائی میں انہوں نے کسی مسافر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

لیکن جلد ہی انگریز خفیہ پولیس انقلابیوں کے پیچھے پڑگئی اور تلاش کا کام زوروشور سے شروع ہوگیا۔ مگر اشفاق اللہ خان وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور پھر بنارس سے ہوتے ہوئے بہار کے ڈالٹین گنج میں پہنچ کر ملازمت کرلی۔ لیکن وطن پرستی کا جذبہ انہیں جلد ہی پھر دہلی کھینچ لایا، جہاں 8 رستمبر 1926ء کو اشفاق اللہ کے ایک ہم وطن اور کلاس فیلو کی مخبری پر انہیں گرفتار کرکے لکھنؤ کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ کاکوری کیس کے تین اور بہادروں کے ساتھ انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

فیض آباد جیل میں بھی اشفاق اللہ کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ پابندی وقت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کرتے رہے اور قرآن کی تلاوت

سے اپنے دل و دماغ کو منور رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر کبھی کسی قسم کا خوف یا وسوسہ غالب نہیں آیا اور جتنے دنوں وہ جیل میں رہے ایک نارمل انسان کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ حتی کہ جب انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تو بھی ان پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ گھبراہٹ ہوتی بھی کیسے؟ انہوں نے تو موت کو اپنی دلہن کے طور پر قبول کیا تھا۔ اشفاق اللہ نے اس موقعے پر اپنے ملاقاتی ساتھیوں سے کہا تھا۔

''تم لوگوں کو ضرور حیرانی ہوگی کہ آج میں اتنا خوش کیوں ہوں اور میں نے اچھے اچھے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟ سو بھئی یہ ٹھاٹ باٹ شادی کی خوشی میں ہیں۔ جانتے نہیں کہ کل میری شادی ہے۔ ارے یارو! یہ تو بتاؤ کہ دولہا کے سنورنے میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ اور پھر وہ اِتنے زور سے ہنسے کہ اُن کے رنجیدہ اور غمگین دوستوں کو بھی بے اختیار ہنسنا ہی پڑا۔

19 ردسمبر 1927ء کو معمول سے کچھ پہلے ہی وہ بیدار ہو گئے۔ نہا دھو کر دھلے ہوئے کپڑے پہنے، نماز پڑھی اور تلاوت کلام پاک کے بعد جو دعا مانگی وہ آج بھی تمام دیش واسیوں کے لئے ایک نمونہ ہے: ''اے خداوند کریم! میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتا، اگر تو میرے آخری وقت کی دعا قبول کر لے تو میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ تو ہر ہندو مسلمان کو عقل دے کہ وہ آپسی جھگڑوں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور دونوں مل کر ملک کو آزاد اور خوشحال بنائیں۔''

حسب روایت آخری آرزو پوچھے جانے پر انہوں نے یہ اشعار پڑھے:

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

اور پھر 'بندے ماترم' کہتے ہوئے پھانسی کے پھندے میں جھول گئے۔

●●●

شیر میسور ٹیپو سلطان

جنوبی ہندوستان میں میسور ایک تاریخی شہر ہے۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے اس علاقے میں حیدعلی نام کا ایک سپاہی تھا۔ وہ اپنی ہمّت اور حوصلے سے ترقی کرتا ہوا میسور کی ریاست کا حکمران بن گیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری حصّے میں انگریزوں نے مدراس میں اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایک کر کے جنوبی ریاستوں کو زیر کرلیں اور اپنی حکمرانی قائم کرلیں۔ انگریزوں نے بعض دیسی ریاستوں کی مدد سے حیدرعلی کی قوت کو کچلنا چاہا، لیکن انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حیدرعلی بھی انگریزوں کی چالوں کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اُس نے تن تنہا انگریزوں کو پے درپے شکستیں دے کر اپنی بہادری کا لوہا منوالیا۔ سن سترہ سو بیاسی (۱۷۸۲ء) میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت اُس کے بیٹے فتح علی ٹیپو کی عمر بیس سال تھی۔

حیدر نے ٹیپو کی اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام کیا تھا اور اُس کو بہترین جنگی تربیت دلائی تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح باہمّت، حوصلہ منداور دلیر تھا۔ سیر و تفریح

میں بھی ٹیپو کو شیر کا شکار بہت پسند تھا۔ وہ تلوار سے شکار کرتا تھا۔ شیر کو بندوق سے مارنا وہ بزدلی سمجھتا تھا۔ اُس کے تخت نشین ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک روز ٹیپو ایک فرانسیسی افسر کے ساتھ شکار کو گیا۔ شیر سامنے آیا تو افسر نے بندوق تان لی۔ ٹیپو نے اُس کو روک دیا۔ اُدھر شیر تیزی سے ان دونوں پر لپکا۔ ٹیپو نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر شیر پر وار کیا اور تلوار کے ایک ہی وار میں شیر کی چاروں ٹانگیں اس کے جسم سے الگ کردیں۔ فرانسیسی افسر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس واقعہ کے بعد سے ٹیپو کو شیر میسور کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

ٹیپو اپنے والد حیدر علی کے ساتھ بہت سی جنگوں میں شریک ہو چکا تھا، جب وہ تخت نشین ہوا تو جنگ کے بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ انگریز بار بار ریاست پر حملے کر رہے تھے، کیونکہ وہ اس ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دو سال مسلسل جنگ کے بعد سن سترہ سو چوراسی ۱۷۸۴ء میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو اپنی شرائط پر صلح کرنے کے لئے مجبور کردیا۔

اس کے بعد بھی انگریز بار بار لڑائی چھیڑتے رہے۔ انہوں نے ٹیپوں کے سرداروں کو جائیدادوں اور جاگیروں کی لالچ دے کر غدّاری پر آمادہ کیا۔ آخری جنگ ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ فوجی سرداروں نے غدّاری کرکے انگریزوں کی مدد کی اور سرنگا پٹنم کے قلعے کے دروازے کھول دیئے لیکن ٹیپو نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا اور دشمن سے لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔ بہادری اور بزدلی کے بارے میں اُس کا یہ جملہ سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے:

”گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔“

ٹیپو کا زیادہ تر وقت انگریزوں سے جنگ میں گزرا۔ وہ جنگ پسند نہیں کرتا تھا لیکن یہ بھی ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہو۔ اُسے حکومت کرنے کی بہت کم مہلت ملی۔ پھر بھی تھوڑے سے وقت میں اُس نے بہت سی

اصلاحات کیں۔ اپنے ہم وطنوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے وہ برابر کوششیں کرتا رہا، اس نے علوم وفنون کی سرپرستی کی، اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک یونیورسٹی بنائی، بہت سی سماجی برائیوں کو ختم کر دیا، لڑکیوں کی خرید وفروخت اور انسانی قربانی گی رسم کو روکا اور ریاست میں امن وامان قائم کیا۔

مذہبی رواداری کی جو مثالیں ٹیپو نے قائم کیں وہ مشکل سے کہیں اور نظر آئیں گے۔ اس نے مندروں کے لئے جائیدادیں وقف کیں اور ان کی حفاظت کا بھرپور انتظام کیا۔ اُس نے زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف خاص توجہ کی۔ آب پاشی کا بہتر انتظام کیا اور دریائے کاویری پر بندھ باندھنے کا منصوبہ بنایا۔ ٹیپو سلطان نے تجارت اور صنعت وحرفت کو بھی ترقی دی۔ ریاست میں جگہ جگہ کارخانے قائم کیے۔ ٹیپو کی دُوراندیشی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دیسی کپڑے اور دیسی چیزوں کے استعمال کے حق میں تھا اور بدیشی چیزوں کے استعمال سے منع کرتا تھا۔

ٹیپو نے ایک طرف ریاست کے استحکام کے لئے اور دوسری طرف عوام کی بہتری کے لئے بہت سی تدبیریں کیں، لیکن انگریزوں کی سازشوں اروا پنوں کی غدّاری کی وجہ سے اُسے زیادہ مدّت تک حکومت کرنا نصیب نہ ہوئی۔ پھر بھی اُس نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہماری تاریخ کا حصّہ ہیں۔

●●●

رابندرناتھ ٹیگور

محمد الیاس

رابندرناتھ ٹیگور کی پیدائش 6مئی 1861ء کوکلکتہ میں ہوئی۔اُن کے والد دیویندرناتھ ٹیگور بہت بڑے زمیندار تھے۔بچپن ہی میں ٹیگور کی والدہ کا سایہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ٹیگور کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا لیکن وہاں اُن کا جی نہیں لگا۔وہ ہمیشہ اسکول سے جی چراتے رہے۔دراصل اسکول میں وہ ایک گھٹن سی محسوس کرتے تھے۔اِس بات کا علم جب ان کے والد کو ہوا تو انہوں نے ٹیگور کو اسکول جانے سے منع کر دیا اور ان کے لئے گھر پر ہی تعلیم کا بندوبست کر دیا۔اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور پڑھائی بھی خوب جی لگا کر کرنے لگے۔

بچپن ہی سے ٹیگور کو شاعری سے لگاؤ تھا۔اُنہوں نے اپنی پہلی نظم 'کمل' صرف آٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی۔اس نظم کو بہت سراہا گیا۔اس سے ٹیگور کا حوصلہ بڑھا اور اُن کی نظمیں رسالوں میں چھپنے لگیں۔بارہ برس کی عمر میں انہوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے 'میکبتھ' کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔

ٹیگور کا ادبی سفر نہایت تیزی سے بلندیاں طے کرنے لگا۔حتی کہ ایک وقت

ایسا آیا کہ جب انہیں دُنیا کے عظیم ترین ایوارڈ 'نوبل پرائز' سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انہیں ان کی کتاب ''گیتانجلی'' پر ملا تھا جو بنگالی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس ایوارڈ سے ان کی شہرت تمام دُنیا میں پھیل گئی اور اُن کا نام دُنیا کے عظیم شعراء کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ٹیگور نے دُنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا جہاں اُن کی بہت عزت افزائی ہوئی۔

ٹیگور صرف بڑے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک کامیاب ڈراما نگار اور اعلیٰ پایہ کے مصور بھی تھے۔ اُن کے مقبولیت کے پیشِ نظر انگریزی حکومت نے انہیں 1915ء میں 'سر' کے خطاب سے نوازا۔ لیکن 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں نہتے ہندوستانیوں کے قتل عام کے احتجاج کے طور پر انہوں نے خطاب واپس کر دیا۔

رابندر ناتھ ٹیگور کو ابتدا ہی سے اسکول کی چار دیواری اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علم کھلی فضا اور کھلے ماحول میں تعلیم حاصل کریں۔ ان کے والد نے پالم پور میں ایک آشرم قائم کیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اسے وسعت دے کر تعلیم کا مرکز بنا دیا جو بعد میں 'وشو بھارتی' کے نام سے مشہور ہوا۔ دراصل یہ اُن کے خواب کی تعبیر تھی۔ اب یہ ایک ایسی یونیورسٹی ہے جو دنیا میں اپنی قسم کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں طلبہ کھلی فضا میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

عمر کے آخری دِنوں میں اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ 7ر اگست 1941ء کو یہ عظیم فنکار اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

•••

ایجادوں کی باتیں

ریل گاڑی

آج جتنے عرصے میں ہم ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتے ہیں۔ سو سال پہلے اتنے ہی وقت میں جموں سے صرف دہلی تک پہنچا کرتے تھے۔

جب ہم برگد کا درخت دیکھتے ہیں جس کی پھیلی شاخوں اور چوڑے چکلے پتوں نے زمین کے ایک اچھے خاصے ٹکڑے کو گھیرے میں لے رکھا ہے، یا کھجور کا درخت جس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی ہے تو یہ قیاس میں لانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سب ایک ننھے سے بیج کا کرشمہ ہے۔

بالکل یہی حالت آج کل کے دیو جیسے اور تیز رفتار ریلوے انجنوں کی ہے جن کی حقیقت آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ بھی نہ تھی۔ ہمیں اُن سائنس دانوں کی ہمت، صبر اور استقلال کی داد دینی چاہیے جنہوں نے ان تھک کوششوں سے بھاپ کو انسان کا غلام بنا دیا اور لوہے کی پٹڑی پر لوہے کے بڑے بڑے انجن دوڑا

دیئے۔

انگلستان میں 1650ء میں، لوہے کی پٹری پر پہیے دار گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔ انہیں گھوڑے کھینچتے تھے اور ان میں کانوں سے کوئلا ڈھویا جاتا تھا۔ لندن میں ایک سواری پٹری پر چلتی تھی۔ اسے بھی گھوڑے کھینچتے تھے۔

جب سائنس دانوں نے بھاپ کی طاقت کا راز معلوم کر لیا تو انہوں نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنانے کی ٹھانی، جو گھوڑے کی جگہ لے سکے۔ اس قسم کی انجن کی ایجاد میں بہت سے سائنس دانوں کا ہاتھ ہے۔ انہیں میں سے ایک انگریز ''ٹری وی تھک'' تھا جس نے 1804ء میں بھاپ کا انجن بنانے کی کوشش کی، مگر ''جارج اسٹیفن سن'' ان سب سے بازی لے گیا۔ ''جارج اسٹیفن سن'' بھی انگریز ہی تھا۔

اسٹیفن سن کو بچپن ہی سے انجنوں سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ان کے کل پرزوں کو دیکھتا بھالتا رہتا تھا۔ آخر وہ سال ہا سال کی محنت کے بعد 1815ء میں ایک ایسا انجن بنانے میں کامیاب ہو گیا جو بھاپ سے چلتا اور پٹری پر دوڑتا تھا۔ اس انجن کا نام راکٹ تھا۔ 1825ء میں انگلستان میں پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی تو اس پر اسٹیفن سن ہی کا انجن چلایا گیا۔ اس انجن نے 1829ء میں 36 میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ کر 500 پونڈ کا انعام حاصل کیا۔

1830ء میں امریکا میں ایک شخص نے پٹری پر چلنے والا انجن تیار کیا اور ایک بگھی سے اس کی دوڑ لگائی۔ لیکن ایک رکاوٹ پیش آنے کے سبب بگھی آگے نکل گئی۔ اس انجن کے مالک کو بہت افسوس رہا لیکن یہ بات ثابت ہو گئی کہ گاڑیوں کا بے جان گھوڑا جاندار گھوڑے پر فوقیت رکھتا ہے۔

1830ء اور 1831ء میں اور بھی انجن بنائے گئے۔ جس سے گاڑیاں کھینچنے کا کام لیا جانے لگا۔ اس سے پہلے تمام انجن جن ڈبوں کو کھینچتے تھے وہ صرف

مال اسباب ڈھونے کے لئے ہوتے تھے۔

آدمیوں کے بیٹھنے کی ان میں جگہ نہ ہوتی تھی لیکن ان انجنوں میں ایسے ڈبے بھی لگائے جانے لگے جن میں آدمی بھی بیٹھ سکتے تھے۔ البتہ یہ تکلیف ابھی باقی تھی کہ جب انجن چلتے چلتے ایک دم کھڑا ہوتا یا کھڑے کھڑے اچانک چل پڑتا تو مارے ہچکولے کے سواریاں آپس میں ٹکرا جاتی تھیں اور انہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ سواریوں کو ایک تکلیف کا سامنا اور بھی تھا۔ اکثر اوقات جنگل میں چلتے چلتے انجن کا ایندھن ختم ہو جاتا تھا۔ ایسے وقت سواریوں کو اتر کر جنگل سے کلڑیاں لاکر انجن کو خوراک کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

دھیرے دھیرے ان سب مشکلات پر قابو پالیا گیا اور ایسے انجن بنائے گئے جو بہت طاقتور بھی تھے اور چلنے میں ہچکولے بھی کم لگتے تھے۔ اب ہر ملک میں ایک سے ایک بہتر انجن بننے لگے اور اس قدر بنے کے بجائے ناموں کے انہیں نمبروں سے پکارا جانے لگا۔

اوّل اوّل تو انسان اور جانور انجنوں سے غیر مانوس رہے، مگر آخر سب کو عادت پڑ گئی اور اب یہ حال ہو گیا کہ جانور ریل کی پٹڑی پر آکر کھڑے ہو جایا کرتے، جنہیں ہٹانے کیلئے انجن کو ڈراؤنی آوازیں نکالنی پڑتی تھیں۔ مگر بعض اوقات جانور پٹڑی پر سے نہ ہٹتا اور مجبوراً گاڑی کو روکنا پڑتا۔ اس تکلیف سے بچنے کیلئے انسان نے ایک ایسا پرزہ ایجاد کیا جو گائے بھینس اور دوسری رکاوٹوں کو جو انجن کے سامنے آئیں اُٹھا کر دائیں بائیں پھینک دے۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جب برصغیر پاک و ہند میں ریل کی پٹڑی کا جال بچھنا شروع ہوا۔ سب سے پہلے ہندوستان میں 1845ء میں کلکتے سے رانی گنج، بمبئی سے کلیان اور مدراس سے ارکونام تک ریل کی پٹڑی بچھائی گئیں۔ 1859ء میں آٹھ کمپنیوں کو پانچ ہزار میل ریلوے لائن تیار کرنے کا ٹھیکا دیا گیا۔ 1860ء

میں کراچی سے کوٹری تک تقریباً 150 میل لمبی پٹڑی بچھائی گئی۔ یہ پاکستان میں پہلی ریلوے لائن تھی۔

جب سے اب تک ریلوے انجنوں نے بہت ترقی کی ہے۔ پہلے پہل بھاپ کے انجن بنے، پھر ان کی جگہ ڈیزل سے چلنے والے انجنوں نے لے لی۔ اس کے بعد بجلی سے چلنے والے انجن بن گئے۔ ڈیزل اور بجلی کے انجن بھاپ کے انجنوں کے مقابلے میں بہت تیز رفتار اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ ریلوے کی بدولت جغرافیائی امتیاز مٹ گئے ہیں گوشے گوشے کے آدمی آپس کے میل جول سے اتحاد والفت کی لڑی میں پرو دیئے گئے۔ اس لحاظ سے ریل بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔

جس طرح انجنوں کی شکل وصورت طاقت اور رفتار میں اضافے ہوئے اسی طرح ریل کے ڈبوں میں بھی طرح طرح کی تبدیلیاں کر کے انہیں بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ آج کل کی گاڑیوں کے ڈبوں میں بجلی کے پنکھے، A.C نرم نرم گدیلے، میز کرسیاں سردی، گرمی اور ریت سے حفاظت کے سامان مہیا کیے گئے ہیں۔ نہانے کے لئے غسل خانے اور لمبے سفروں میں گاڑیوں کے ساتھ کھانے کے ڈبے بھی ہوتے ہیں۔

●●●

ہوائی جہاز

انسان پرندوں کو ہوا میں اڑتے دیکھ کر دل میں کہا کرتا تھا کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی طرح میں بھی ہوا میں اڑنے لگوں؟

اُڑنے کا شوق دھیرے دھیرے بڑھتا گیا اور ان خیالی باتوں نے کہانیوں کی شکل اختیار کرلی۔ سردی کی لمبی راتوں میں لحافوں میں دبکے ہوئے بچّے جب بڑے بوڑھوں سے کہانیاں سنتے تو ان میں ایسی کہانیاں بھی ہوتیں جن میں اُڑن کھٹولے کا ذکر آتا یا بتایا جاتا کہ ایک بادشاہ کے پاس جادو کا ایک قالین تھا جس پر بیٹھتے ہی وہ ہوا میں اڑنے لگتا اور آنکھ جھپکتے ہی کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔

ابتداء میں انسان کود کود کر اور بڑے بڑے پرندوں کے پر بازوں سے باندھ کر ہوا میں اڑنے کی کوشش کرتا، لیکن دھڑام سے زمین پر آ رہتا۔ دیکھنے والے ان سرپھروں کا مذاق اڑاتے مگر انہوں نے ان کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھا۔

ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے۔ ایک دن ایک آدمی نے آگ کے اوپر تنے

ہوئے کپڑے کو ہلتے دیکھا تو اس نے اندازہ کیا کہ اسے دھواں ہلا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے کپڑے کا ایک بڑا سا تھیلا بنالیا اور اس کے نیچے آگ سلگائی آگ سے ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھی اور تھیلے میں جمع ہوتی رہی۔ جب تھیلا ہوا سے بھر گیا تو اس نے تھیلے کا منھ اچھی طرح بند کر کے چھوڑ دیا تھیلا اڑا اور جس سمت اسے ہوا لے گئی چلا گیا۔

آپ نے بیاہ شادی کے موقعوں پر باریک رنگ دار کاغذ کے غبارے اڑتے دیکھے ہوں گے۔ یہ بالکل اسی طرز پر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے نیچے تار باندھ کر اور ان میں کپڑے کی کچھ دھجیاں لگا کر انہیں آگ لگا دیتے ہیں جس کے باعث غبارے کے اندر کی ہوا گرم ہو جاتی ہے اور وہ اڑنے لگتا ہے۔

اس تھوڑی سی کامیابی نے انسان کے حوصلے بڑھا دیئے بعض دوسرے لوگوں نے معمولی سوچ بچار کے بعد یہ اندازہ کیا کہ اگر اس غبارے کو بڑا کر دیا جائے تو وہ اپنے ساتھ کچھ بوجھ بھی اٹھا کر لے جا سکے گا۔ اس خیال کے آتے ہی فرانس کے دو بھائیوں، جوزف مانٹ گول فیئر اور جیکس مانٹ گول فیئر۔ جو 1783ء میں ایک تھیلا تیار کیا جس میں گرم ہوا بھری گئی، پھر اس کے نیچے ایک ٹوکری باندھ کر اور اس میں ایک بطخ ایک بھیڑ اور ایک مرغ بٹھا کر اس کو ہوا میں چھوڑ دیا گیا۔ غبارہ ان کو لے کر 547 گز اوپر اٹھا اور پھر کچھ فاصلے پر ایک جنگل میں اتر گیا۔ یہ تینوں مسافر آرام سے نیچے اتر آئے۔ بھیڑ تو جنگل میں سرسبز گھاس چرنے لگی، بطخ قریب ہی ایک جوہڑ میں خوشی سے تیرنے لگی اور مرغ اپنا ہوائی سفر کامیابی سے ختم ہونے پر ککڑوں کوں کا نعرہ لگانے لگا۔

اس کامیابی پر لوگ بہت خوش ہوئے لیکن ابھی تک ایسی صورت نہ نکلی تھی جس سے انسان بھی اڑ سکے۔ آخر 1784ء میں دو انگریزوں نے غبارے کے ذریعے کامیاب پروازیں کیں۔ یہ غبارہ پچیس منٹ تک ہوا میں اڑتا رہا۔ اس

عرصے میں اس نے پانچ میل کا سفر طے کیا۔ 1785ء میں دو انگریزوں ہی نے غبارے میں بیٹھ کر دوبارہ انگلستان کو پار کیا۔ لیکن اس میں یہ مشکل تھی کہ غبارے کے اندر کی ہوا گرم رکھنے کے لئے اس کے نیچے انگیٹھی جلانی پڑی تھی، جب کوئلے ختم ہو جاتے تو غبارا نیچے چلا آتا۔ پھر بھی ایسے غباروں میں انسان نے ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار میل لمبا سفر کیا۔ اس زمانے میں ہائیڈروجن گیس بھی دریافت ہو چکی تھی جو گرم ہوا سے چودہ گنا زیادہ ہلکی ہوتی ہے۔ جب غباروں میں اس گیس کو بھر کر اڑایا گیا تو یہ زیادہ مفید ثابت ہوئی۔

اب تک ان غباروں کی یہ حالت تھی کہ ہوا جس طرف چاہتی انہیں لے جاتی۔ انسان کی یہ خواش تھی کہ کوئی ایسی چیز تیار ہو جائے جس سے وہ غبارے کو جدھر چاہے موڑ سکے، چلا سکے اور روک سکے۔ ہوائی چپوؤں سے چلانے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر سگار کی صورت کا ایک غبارہ بنا کر اس کے آگے پنکھا لگایا گیا۔ اس پنکھے کو چلانے کے لئے ایک ہلکا سا بھاپ کا انجن لگایا گیا۔ اس طرح غبارے کو ہوا کی مخالف سمت میں لے جانے میں کسی حد تک کامیابی ہو گئی۔ تھوڑے عرصے بعد اسٹیم انجن کو پٹرول انجن میں بدل دیا گیا۔

جرمنی کے مشہور سائنس دان زیپلن نے ہائیڈروجن گیس کے بڑے بڑے ہوئی جہاز بنائے اور پہلی جنگ عظیم مین ان سے کئی شہروں پر بم باری کی گئی۔ لیکن ان میں بہت سی خامیاں تھیں اور زیپلن کو تباہ کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

امریکا والوں نے ہائیڈروجن کی بجائے ہیلیم گیس استعمال کرنے کی کوشش کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہیلیم گیس آگ نہیں پکڑتی، لیکن قیمتی ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال قریب قریب ناممکن تھا۔

آخر امریکا کے دو بھائیوں نے ایسا ہوائی جہاز ایجاد کیا جو انجن کے ذریعے چلتا تھا۔

موجودہ ہوائی جہاز کی ایجاد کا سہرا امریکا کے انہی بھائیوں اورول رائٹ اور ولبر رائٹ کے سر ہے۔ یہ دنیا کے پہلے انسان تھے جنہوں نے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پرواز کی یہ دونوں بھائی امریکا کے ایک شہر ڈیٹن میں بائیسکلوں کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے پہلے گلائیڈر بنائے، پھر ایک موٹر کار کی پٹرول انجن میں تبدیلی کر کے اسے اس قابل بنالیا کہ وہ پنکھے کو چلا سکے۔ یہ انجن انہوں نے ایک بائی پلین گلائیڈر میں لگا دیا۔

17 / دسمبر 1903ء کو اورول اور ولبر اس ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑے۔ دونوں نے دو دو اڑانیں کیں۔ پہلی اڑان بارہ سیکنڈ دوسری اور تیسری اس سے ذرا زیادہ دیر اور چوتھی 9 منٹ تک جاری رہی۔ آخری پرواز میں وہ 852 فٹ کی بلند تک پہنچے۔

رائٹ برادران اپنے اس جہاز میں برابر اصلاحیں کرتے رہے اور 1908ء میں ولبر نے ایک گھنٹے 20 منت تک پرواز کی۔ ہوابازی کے میدان میں اس عظیم کامیابی پر ان دونوں بھائیوں کو دنیا بھر میں اعزاز ملے۔ اور اب ہر ملک ہوائی جہاز بنانے لگا۔ لیکن ان جہازوں کے انجن موٹر کار کے انجن کی طرح ہوتے تھے، اور ان کی رفتار بھی اتنی زیادہ نہ تھی۔ جب جیٹ انجن ایجاد ہوا تو ہوائی جہازوں کی رفتار بڑھ گئی۔ اور وہ زیادہ دور تک پرواز کرنے لگے۔

ریل گاڑیوں کے ذریعے جو سفر دنوں میں طے ہوتا تھا، اب جہازوں کے ذریعے وہی سفر گھنٹوں میں ہونے لگا ہے۔ قریب قریب تمام ملکوں کی اپنی اپنی ہوائی کمپنیاں ہیں جو دن رات مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے میں مصروف رہتی ہیں۔

ہوائی جہازوں کی ایجاد سے جہاں انسان کو فائدہ پہنچا وہاں نقصان بھی ہوا۔ پچھلی جنگ عظیم میں ہوائی جہازوں نے بہت تباہی مچائی۔ ان کی بمباری

سے سینکڑوں بستیاں اجڑ گئیں اور لاکھوں انسان مارے گئے۔ اب بھی جنگ جیتنے کیلئے ہوائی جہازوں کو بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر ملک کی یہ کوشش ہے کہ اس کا ہوائی بیڑا زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا کہ جنگ کے وقت وہ دشمن کی فوجوں پر بمباری کر کے انہیں تہس نہس کر سکے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا جا رہا ہے نئی نئی قسم کے ہوائی جہاز بنتے جا رہے ہیں۔ اب ان کی رفتار آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ ایسے جہاز بھی بنا لیے گئے ہیں جو ہوا میں اڑنے کے علاوہ سمندر میں بھی تیر سکتے ہیں اور ایسے جہاز بھی ایجاد ہو گئے ہیں جن کو اڑنے اور اترنے کے لئے ہوائی اڈے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کھڑے کھڑے ایک دم اوپر اٹھ جاتے اور نیچے اتر آتے ہیں۔ انہیں ہیلی کاپٹر کہا جاتا ہے۔

●●●

فوٹو گرافی اور سینما

انیسویں صدی کی ابتداء میں فرانس اور انگلستان میں سائنس دان یہ بات معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ بعض کیمیاوی مرکبات پر آفتاب کی کرنوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ سر ہمفری ڈیوی نے معلوم کیا کہ اگر کسی کاغذ کو سلور نائٹریٹ میں تر کرلیا جائے اور پھر اس پر کسی شئے کا عکس ڈالا جائے تو اس شئے کا عکس اس کاغذ پر اتر آئے گا۔ لیکن وہ اس عکس کو پائیدار بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

فرانس کے ایک شخص نیپلس نے بٹولن کے استعمال سے پائدار تصویریں اتاریں۔ اس طرح موجودہ زمانے کی عکسی تصاویر کی بنیاد ڈالی گئی۔ لیکن ایک تصویر کے اتارنے میں نیپلس کے دس گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف عمارتوں کی تصویر کھینچ سکتا تھا۔

لوئی جیکس ڈیگرے نے جب نیپلس کی ایجاد کا حال سنا تو وہ اس کے پاس گیا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر کام شروع کیا۔ انہوں نے بہت کچھ ترقی کی

لیکن اب بھی تصویریں دھندلی اترتی تھیں۔

غرض فوٹو گرافی کی ایجاد میں بہت سے سائنس دانوں نے حصہ لیا۔ لیکن اصل کامیابی ایک انگریز، فاکس ٹالبوٹ کو ہوئی۔ اس نے 1833ء میں اپنے کیمرے سے جو تصویریں اتاریں وہ بہت صاف اور واضح تھیں۔ انہیں دونوں فرانس کا ایک شخص، واگوترے، بھی کیمرا بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔

ٹالبوٹ اپنے کیمرے میں ایسا کاغذ استعمال کرتا تھا جس پر کیمیائی مادے لگے ہوتے تھے۔ واگوترے نے تانبے کی پلیٹیں استعمال کیں جن پر چاندی منڈھی ہوئی تھی 1851ء میں پہلی مرتبہ شیشے کی پلیٹیں استعمال کی گئیں۔ اور 1884ء میں سلولائڈ کی فلم ایجاد ہوئی۔

چلتی پھرتی تصویریں اتارنے والا (مودی) کیمرہ ایک انگریز، ولیم فریسے گرین کی ایجاد ہے۔ امریکی موجد ایڈیسن اور فرانسیسی موجد لومیرے نے بھی اس سلسلے میں تجربے کئے تھے۔

1893ء میں ایڈیسن نے سینما کی ایک مشین ایجاد کی جس کا نام اس نے کنیٹو سکوپ (Kine to scope) رکھا۔ ایک ہینڈل گھمانے سے فلم محدب شیشے کے سامنے سے گزرتی تھی جس سے دیکھنے والے کو تصویریں اصل سائز سے بڑی نظر آتی تھیں۔ دیکھنے کے لئے ایک چھوٹا سا سوراخ رکھا گیا تھا۔

سینما اگرچہ آہستہ آہستہ ترقی کر رہا تھا تاہم یہ مکمل نہیں ہوا تھا ابھی میجک لینٹرن جیسی ضروری ایجاد ہونے والی تھی جو فلم کی تصویروں کا عکس جلد جلد اور اسی رفتار سے ایک پردے پر ڈال سکتی تھی جس رفتار سے وہ تصویریں لی گئی تھیں۔ ایک انگریز نے جس کا نام رابرٹ پال تھا ایسی مشین ایجاد کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک طویل عرصے کی ان تھک کوشش کے بعد 1895ء میں اسے کامیابی نصیب ہوئی

۔اس کی ایجاد بھی نامکمل تھی ۔اس میں کئی ایک تبدیلیاں ہوئیں۔حتی کہ میجک لینٹرن بن گئی۔

بولتی تصویروں کی ایجاد سے سینما کو اور ترقی ہوئی اس سے پہلے خاموش تصویریں ہی دکھائی جاتی تھیں۔اب تصویریں بولنے بھی لگیں۔اول اول آواز کے ریکارڈ بھرے جاتے تھے جو فلم دکھاتے وقت پردے کے پیچھے لگادیئے جاتے تھے لیکن اب فلم پر ہی آواز بھرلی جاتی ہے۔سنیما کا پردہ میجک لینٹرن کے پردے کی طرح صرف کپڑے کا نہیں ہوتا بلکہ خاص طور پر اس قسم کا تیار کیا جاتا ہے جس پر آواز اثر کرے۔اس کے پیچھے آواز کو بلند کرنے کے لئے لاؤڈ سپیکر رکھے ہوتے ہیں۔

آج کل کے سینما میں فلم ایک مشین کے ذریعے چلتی ہے اور اس کی ریلیں تیار کی جاتی ہیں ایک ریل میں کئی ہزار تصویریں ہوتی ہیں۔فلم مشین سے اس تیزی سے گزرتی ہے کہ ایک سیکنڈ میں چوبیس تصویریں شیشے کے سامنے آتی ہیں ہر تصویر ایک لمحے کے لئے ٹھہرتی ہے۔اس طرح جلد جلد یکے بعد دیگرے سب تصویریں سامنے آتی ہیں ان کا عکس پردے پر اترتا ہے جو شیشے کی وجہ سے تصویر کے اصل سائز سے بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔

سنیما صرف تفریح ہی کا ذریعہ نہیں، تعلیم کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے تقریباً ہر ملک میں تعلیمی اور معلوماتی فلمیں بنائی جاتی ہیں جن سے عوام کے علم میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

●●●
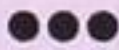
ٹیلی ویژن

ٹیلی ویژن اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص جان لوئی جی بیرڈ نے ایجاد کیا تھا۔ ایک دن وہ سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اس کے کانوں میں گانے کی آواز آئی ۔اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو پتا چلا کہ پاس ہی ایک ہوٹل میں ریڈیو بج رہا ہے۔

اُس نے سوچا کی ہوا کی لہروں پر آواز کتنی دور تک چلی جاتی ہے! کیا ان لہروں پر تصویر، ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتی؟ اُسے فوٹوگرافی کا شوق تھا وروہ کئی مرتبہ تصویروں اور بجلی کے تاروں پر تجربے کر چکا تھا۔اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ ہوا کی لہروں پر تصویریں بھیج کر رہے گا۔

اُس نے اسی دن ایک صندوق، کپڑا سینے کی چند سوئیاں، بسکٹوں کا ایک ڈبا ۔سائیکل کے لیمپ کا شیشہ کچھ بیٹریاں، بجلی کا ایک تار اور بہت سا موم اکٹھا کیا۔ اس کے بعد بجلی سے چلنے والی ایک پرانی موٹر خریدی۔ اوراس سامان کو لے کر ایک کمرے میں بند ہوگیا۔

ایک عرصے تک وہ دن رات اسی کمرے میں تجربے کرتا رہا۔ اس نے سامنے ایک پردہ لگایا ہوا تھا۔ آخر ایک دن اس پردے پر تصویر آ گئی لیکن وہ کچھ زیادہ صاف نہ تھی۔ اس پر بیرڈ نے زیادہ تیز روشنی استعمال کرنے کی سوچی۔ اس نے ایک ہزار بیٹریاں ایک ساتھ دی اور کئی دنوں کی محنت کے بعد آخر پردے پر صاف تصویریں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب بیرڈ نے کئی مشہور سائنس دانوں کو اپنا یہ کارنامہ دکھایا۔ یہ سائنس دان بھی ٹیلی ویژن ایجاد کرنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے بیرڈ سے کہا کہ تم نے میدان مار لیا ہے۔ اگلے ہی دن برطانیہ کے تمام اخباروں میں بیرڈ کی اس حیرت انگیز ایجاد کا حال چھپ گیا۔ یہ 1926ء کی بات ہے۔

30/دسمبر 1929 کو بی بی سی لندن نے ٹیلی ویژن کا جو پہلا پروگرام پیش کیا۔ اس میں بیرڈ ہی کا طریقہ ایجاد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے سائنس دانوں نے ٹیلی ویژن میں اصلاحیں کی اور بیرڈ کے طریقے سے ہٹ کر دوسرے طریقے ایجاد کیے۔ لیکن ٹیلی ویژن کا باوا آدم بیرڈ ہی کو مانا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کا اصول یہ ہے کہ کسی چیز کے سیاہ اور سفید حصّوں کو برقی اختلافا (مثبت اور منفی بجلی) میں تبدیلی کر کے برقی لہروں کے ذریعے فضا میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ وصول کرنے والا آلہ (ٹیلی ویژن سیٹ) ان برقی اختلافات کو دوبارہ سیاہ اور سفید حصّوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہمیں ٹیلی ویژن کی سکرین پر اس چیز کی تصویر نظر آتی ہے۔ رنگین ٹیلی ویژن بہت بعد کی ایجاد ہے اور یہ بلیک اینڈ وائٹ سے زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔

●●●

بجلی

الٰہ دین اور اُس کے چراغ کی داستان بہت مشہور ہے۔اس چراغ کی مدد سے الٰہ دین جن سے بڑے سے بڑا کام کرالیتا تھا۔ آج الٰہ دین کا چراغ تو موجود نہیں مگر ایک دوسری طاقت پر انسان نے قابو پالیا۔۔۔جس کا نام بجلی ہے۔

آج سے ایک سو سال پہلے بجلی کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا، اور آج یہ حالت ہے کہ کوئی کام ایسا نہیں جو بجلی نہ کرسکتی ہو۔ یہ ایک نہایت فرماں بردار خادمہ کی طرح ہر وقت حکم کی منتظر رہتی ہے۔ جونہی بٹن دباتے ہیں، یہ کام پر لگ جاتی ہے۔رات کی تاریکی کو دور کر کے ہمارے کمرے روشن کرتی ہے ہمیں گرمی سے بچانے کے لئے پنکھے چلاتی ہے۔ ہمارے کمرے کو ہماری خواہش کے مطابق گرم یا سرد کرتی ہے۔ گھنٹیاں بجاتی ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک لمحے میں پیغام پہنچاتی ہے۔ کپڑے دھونے نچوڑنے اور استری کرنے کے لئے بجلی کے آلات استعمال ہوتے ہیں۔ گھر کے فرنیچر، دریوں اور قالینوں کو بجلی کے جھاڑو سے صاف کیا جاتا ہے۔ کھانا بجلی کی انگیٹھیوں پر پکایا جاتا ہے اور تو اور

ریل گاڑیاں اور موٹریں بجلی سے چلتی ہیں۔ ایک انچ کے دس ہزاروں حصے کی پیمائش بجلی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن اور سینما بھی بجلی ہی کے کرشمے ہیں۔

بجلی کوئی مادی شئے نہیں بلکہ حرارت کی طرح ایک قوت یا اثر کا نام ہے۔ اس کا نام ایک یونانی لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی عنبر کے ہیں۔ یونانیوں کو معلوم تھا کہ عنبر کو رگڑا جائے تو ہلکی چیزیں مثلاً تنکے اور بھوسا اس کی طرف کھنچتے ہیں عنبر کے علاوہ مقناطیسی لوہے کا بھی لوگوں کو علم تھا۔ اس میں لوہے کو کھینچنے کی ویسی ہی قوت ہوتی ہے۔

آہستہ آہستہ سائنس دانوں نے مزید مشاہدے شروع کیے اور بجلی کے متعلق ہمارا علم بڑھنے لگا، گزشتہ سو سال کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ وہ تمام اشیا جنہیں ہم ٹھوس جانتے ہیں در اصل ٹھوس نہیں ہیں۔ انہیں ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ صرف مثبت اور منفی بجلی کے ذخیرے ہیں جس مادے میں یہ ذخیرے بہت کثرت سے ہوں اس میں سے بجلی بآسانی گزر سکتی ہے۔ تانبا بجلی کے گزرنے کے لئے بہترین مادہ ہے۔ اسی لئے بجلی کے تمام تار تانبے کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ربڑ، لکڑی اور چینی مٹی جیسے مادے بجلی گزارنے کے لئے اتنے کمزور ہیں کہ ان کا استعمال بطور بجلی روکنے کے آلات کے ہوتا ہے۔ ربڑ کے تلوے والے جوتے پہن کر بجلی کے تار پر کھڑے ہو جائیں تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض مادے مثلاً کاربن بجلی گزارنے کے لئے اتنے کمزور ہیں کہ بجلی کی رَو جب ان میں سے گزرتی ہے تو وہ بہت مزاحمت کرتے ہیں اور گرمی سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ بجلی کا روشنی دینے والا قمقمہ اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔

بجلی کی رو دو طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے رگڑ سے اور کیمیائی عمل سے۔

اگر شیشے کی ایک سلاخ کو ریشم کے کپڑے پر رگڑ کر کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے قریب لے جایا جائے تو ٹکڑے اس سلاخ سے چمٹ جائیں گے۔ اسی طرح گھاس کے تنکے بھی چمٹ جاتے ہیں اور پھر گر پڑتے ہیں۔ اس رگڑ سے شیشے کی سلاخ میں بجلی کی ہلکی سی رو پیدا ہو جاتی ہے۔

بجلی گھروں میں جنریٹروں کے ذریعے وسیع پیمانے پر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر اسی سلسلے میں پانی کی تیز روانی سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ پانی بجلی پیدا کرنے والی مشین (جنریٹر) کو چلاتا ہے۔

برسات کے موسم میں جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں تو کبھی کبھی بجلی کوندتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آسمانی اور رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی دونوں ایک ہی ہیں۔ کرۂ ہوائی کے اونچے اونچے مقامات پر ہر وقت کم و بیش بجلی موجود رہتی ہے۔ آبی بخارات میں بھی بجلی ہوتی ہے۔ برسات میں چونکہ آبی بخارات زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں اس لئے بجلی زیادہ جمع ہو جاتی ہے بادلوں میں مثبت اور منفی دونوں قسم کی بجلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو تیزی سے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ چونکہ یہ کشش کا عمل نہایت تیزی سے ہوتا ہے اس لئے بادلوں کے درمیان کی ہوا کو رگڑ لگتی ہے اور وہ دبتی ہے۔ رگڑ سے اس میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت کی تیزی سے چمک، جسے ہم بجلی کا کوندنا کہتے ہیں، جب ہوا دیتی ہے تو اس سے آواز پیدا ہوتی ہے جسے ہم بادل کا گرجنا کہتے ہیں۔ یہ چمک اور گرج ایک ہی وقت میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر چونکہ آواز کی رفتار روشنی کی رفتار سے کم ہے اس لئے ہمیں گرج چمک سے تھوڑی دیر بعد سنائی دیتی ہے۔

مقناطیس بھی بجلی کی قسم کی طاقت ہے۔ ایک خاص قسم کے معدنی پتھر میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پہلے پہل یہ پتھر ایشیائے کوچک کے مقام مقنیطہ میں بکثرت دستیاب ہوتا تھا غالباً اسی وجہ

سے اس کا نا مقناطیس رکھا گیا۔ اس پتھر کے ساتھ لوہے کو رگڑا جائے تو اس میں بھی مقناطیسی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لوہے میں بجلی کی رو جاری کرنے سے بھی اس میں مقناطیسی خواص پیدا ہو سکتے ہیں۔

زمین کے قطبوں میں بھی مقناطیسی قوت بہت ہے۔ اگر ایک مقناطیسی خواص رکھنے والی سوئی کو کسی ڈاٹ (کارک) میں آر پار چبھو کر اس ڈاٹ کو پانی سے بھری ہوئی طشتری میں تیراؤ تو معلوم ہوگا کہ اس وئی کے سرے شمالاً جنوباً رہتے ہیں۔ اگر ڈاٹ کو مختلف سمتوں میں گھما کر چھوڑ دیا جائے تو بھی گھوم گھما کر سوئی شمالاً و جنوباً رخ پر تھمے گی۔ قطب نما اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس آلے میں ایک نازک سی سوئی ایک نوک پر تیرتی ہے اس سوئی میں مقناطیسی اثر ہوتا ہے اور اس کے دونوں سرے ہمیشہ شمالاً جنوباً رہتے ہیں۔

•••

پہیّا

آیئے ہم آپ کو ایسی دُنیا دکھائیں جہاں سواری کے لئے کاریں تھیں نہ ہوائی جہاز، ریلیں تھیں نہ بسیں، تانگے تھے نہ بگھیاں، بھار برداری کے لئے لاریاں تھیں نہ بیل گاڑیاں، چھکڑے تھے نہ ٹھیلے، لوگوں کو اگر کہیں آنا جانا ہوتا تو پیدل ہی آتے جاتے، یا جانوروں پر سواری کرتے اور اگر کہیں مال اسباب لے جانا ہوتا تو اپنے سر یا چوپایوں کی پیٹھ پر لاد کر لے جایا کرتے تھے۔

اگر آپ کو اس دنیا میں لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا تو یقیناً آپ کو وحشت ہو جاتی اور آپ تنگ آ کر پکار اٹھتے کہ ایسی دنیا سے توبہ ہی بھلی!

آج سے ان گنت سال پہلے اس دُنیا کی یہی حالت تھی، یہ سب اس گول پہیے ہی کے کرشمے ہیں جس کو آپ ہر وقت چکر کھاتے اور دوڑتے دیکھتے ہیں۔ اس کی بدولت آج مہینوں کے سفر پلوں میں کٹتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی حالت کا آج کل کے زمانے سے مقابلہ کرنے سے پہیے کی حیرت انگیز ایجاد کا راز کھلتا ہے۔

جب پہلے پہل انسان نے لکڑی کا پہیا بنایا تو وہ یقیناً اس زمانے کے لوگوں کے لئے ایسی ہی حیران کر دینے والی ایجاد تھی جیسے آج کل کے لوگوں کے لئے ریڈیو، ٹیلیفون اور دوسری طرح طرح کی ایجادات۔

لوگ شروع شروع میں بوجھ کو اپنے سر یا پیٹھ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتے تھے۔ جب انہوں نے عقل سے کام لے کر جانوروں پر قابو پالیا تو ان پر بوجھ لاد کر ڈھونے لگے لیکن کئی ایسی بھاری اور بوجھل چیزیں بھی تھیں جنہیں نہ تو وہ خود اٹھا سکتے تھے اور نہ وہ جانوروں پر ہی لادی جا سکتی تھیں۔ وہ ان کو دھکیلتے کھینچتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے بھاری بھر کم چیزوں کے نیچے درختوں کے گول گول تنے کاٹ کر رکھ دیئے جاتے اور لوگ ان بھاری چیزوں کو لڑھکاتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے۔ لکڑی کے گول تنوں کو آسانی سے زمین پر لڑھکتے دیکھ کر موٹے موٹے گول ٹکڑوں سے پہیے بنا لینا انسانی عقل کے لئے کچھ مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ درختوں کے تنوں سے موٹے موٹے ٹکڑوں کے دو پہیے کاٹ کر ان کے درمیان ایک مضبوط لاٹھی یا سلاخ گاڑ دی جاتی اور اس کے اوپر بوجھ لاد کر اسے کھینچا یا دھکیلا جانے لگا۔

پرانے زمانے کے پہیے آج کل کی موٹر کاروں، ریل گاڑیوں اور طرح طرح کی پہیے دار چیزوں کی صحیح معنوں میں ابتدا ہیں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان پہیوں کی شکل وصورت زمانے کی ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتی چلی گئی اور ان سے رتھیں، بگھیاں، تانگے، ٹمٹمیں اور بوجھ ڈھونے کے لئے بیل گاڑیاں تیار ہونے لگیں۔

قدیم زمانے کے مصری، شامی، ایرانی، یونانی اور رومن رتھ کی قسم کی گاڑیوں میں سوار ہوتے، انہی میں بیٹھ کر سیر وتفریح کا لطف اٹھاتے اور انہی پر چڑھ کر جنگ لڑتے تھے۔ رتھ اتنی چھوٹی ہوتی تھی کہ اس میں ایک دو آدمی بیٹھ سکتے تھے اور جب رتھ کے گھوڑوں کو تیز ہانک دیا جاتا تو مارے ہچکولوں کے اس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی آنتیں تک ہل جاتی تھیں۔

ایک سے زیادہ سواریوں کیلئے رفتہ رفتہ بگھیاں، بیل گاڑیاں، اور اسی قسم کی

دو دو اور چار پہیے والی گاڑیاں بننے لگیں جن رتھوں کی نسبت تکلیف بھی کم ہوتی اور سفر بھی جلدی کٹتا تھا۔

لیکن اتنی بڑی گاڑیوں کو سوائے امیروں کے کون رکھ سکتا تھا۔ آخر ہلکے پھلکے پہیوں والی کم خرچ گاڑیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بائیسکل کی ایجاد ایسے ہی زمانے کی یادگار ہے۔ اب گھوڑا گاڑیاں، تانگے اور یکے کرائے پر بھی چلنے لگے اور انسان ضروریات زندگی کی تلاش کے علاوہ سیر و تفریح کے لئے بھی سواریوں کو کام میں لانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ ایسی پہیے دار سواریاں ایجاد کرے جو نہ صرف ہلکی پھلکی ہوں بلکہ اسے ہچکولوں سے بھی نجات دلا دیں اور اس کے ساتھ سفر بھی تیزی سے کٹ جائے۔

سوچتے سوچتے آخر انسان نے ربڑ والے پہیے ایجاد کیے اور بیل یا گھوڑے کے بجائے ان میں طاقت ور انجن لگا کر ایسی گاڑیاں ایجاد کیں جن میں کئی کئی آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ اور بڑے آرام سے گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ موٹر سائیکل، موٹر کار، بسیں اور لاریاں اسی ایجاد کی مختلف صورتیں ہیں۔

جہاں ربڑ والی پہیے دار سواریوں کے لئے انسان صاف اور ہموار سڑکیں تیار کیں، وہاں اس نے سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں کو ایک ہی وقت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے اور منوں بوجھ آسانی اور تیز رفتاری سے ڈھونے کے لئے لوہے والے پہیوں کی ریل گاڑیاں بھی ایجاد کیں اور ان کے چلنے کے لئے زمین پر لوہے کی پٹڑی کا ایک جال بچھا دیا۔ جس سے آج دُنیا کی مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے میل ملاپ اور کاروبار کرنے میں بہت آسانیاں ہوگئی ہیں۔

•••

خوابی ایجادات

صبا ارم

وہ چیزیں جو خواب دیکھ کر ایجاد کی گئیں

ایجاد اس کے موجد کی بے پناہ ہمت او محنت کا حاصل ہوتی ہے۔ بہت سی ایجادات ایسی ہیں جن پر برسوں کی محنت صَرف ہوتی ہے۔ یہاں ہم کچھ ایسی ایجادات کا ذکر کریں گے جو ''خواب'' کی بدولت ممکن ہوئیں۔ خواب کیا ہیں؟ ان کے متعلق ماہرین صرف اس حد تک جان سکے ہیں کہ یہ دن بھر ہونے والے واقعات کا عکس ہوتے ہیں۔ ہر انسان رات کے ایک تہائی حصے میں خواب دیکھتا رہتا ہے۔ ہر خواب میں دن بر پیش آنے والے واقعات کا عکس اور مشکلات کا حل ہوتا ہے بشرطیکہ یہ یاد رہ جائیں۔ یہ ایجادات بھی خواب ہی کی وجہ سے ناممکن سے ممکن بنیں۔ اس طرح ہم انہیں خوابی ایجادات بھی کہہ سکتے ہیں۔

پہلا خواب

سلائی مشین بھی بہت اہم ایجاد ہے۔ اس سے دنوں کا کام گھنٹوں میں

ہو جاتا ہے۔ اس کا موجد تھیلما کرنز تھا۔ اسے بچپن سے ہی تعلیم کا شوق تھا۔ ہر بات پر غور کرنا اس کی عادت تھی۔ اس زمانے میں نئی نئی ایجادات ہو رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں بھی کسی چیز کی ایجاد کا خیال آتا تھا۔ ایک روز بیٹھا کسی آدمی کو کپڑے سیتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیا کوئی ایسی مشین ہو سکتی کہ یہ کام آسان ہو جائے۔ غور و فکر کی عادت تو اسے تھی، چنانچہ اس نے کسی ایسی مشن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر کار فی محنت کے بعد اس نے ایک مشین تیار کی لیکن اب ایک بہت بڑا مسئلہ اس کے سامنے تھا اور وہ یہ تھا کہ سوئی میں دھاگا کس طرح ڈالے؟ عام سوئیوں میں تو ایک طرف نوک ہوتی ہے اور دوسرے سرے کی طرف سوراخ کر کے دھاگا ڈالا جاتا ہے۔ اب تھیلما کافی پریشان تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقہ آزما ڈالا۔ کبھی دھاگہ سوئی کی نوک کی نیچے رکھ کر چلایا، کبھی گرہ لگا کے، لیکن کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پوری مشین تیار ہو چکی تھی لیکن یہ مسئلہ حل ہی نہ ہو رہا تھا اور اب اسے اپنی ایجاد ناممکن نظر آنے لگی تھی۔ آخر وہ غور کرتا رہا۔ ایک دن وہ اپنی خواب گاہ میں بیٹھا اسی مسئلے پر سوچ رہا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں اسنے دیکھا کہ ایک بڑی سی سوئی اس کے سامنے ہے۔ وہ کافی لمبی ہے اور اس کی نوک سے ذرا اوپر ایک سوراخ ہے۔

آنکھ کھلنے پر جب یہ خواب تھیلما کو یاد آیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کا ایک مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور پھر سے کام میں لگ گیا۔ اس نے سوئی کی نوک سے ذرا اوپر ایک سوراخ کیا اور اس میں دھاگا ڈال کر مشین چلائی۔ اس طرح یہ ایجاد تکمیل کو پہنچی، جس میں بلاشبہ تھلیما کی محنت، ہمت بلکہ خواب کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہ ایجاد ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔

دوسرا خواب

ذیابیطس ایک بہت خطرناک بیماری ہے۔ اس بیماری کا سبب جسم میں انسولین نامی ایک مادے کی کمی ہے۔ انسولین لبلبہ میں پیدا ہوتی ہے، جس سے جسم میں شکر کی مقدار کنٹرول رہتی ہے۔ انسولین لبلبہ کے مرکزی حصے میں بنتی ہے جسے لینگر ہانز کہتے ہیں۔ ذیابیطس (شوگر) سے بچاؤ کے لئے اس مرکزی حصے کا صحت مند رہنا بہت ضروری ہے۔

سائنس داں بہت عرصے تک کوئی ایسی دوا ایجاد نہ کر سکے تھے جس سے لینگر ہانز صحت مند رہ سکے یا اس بیماری کا علاج ہو سکے۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں میں فریڈرک پینٹنگ بھی شامل تھا۔ وہ بڑے عرصے تک اپنے ساتھی بیسٹ کے ساتھ خاموشی سے تحقیق میں مصروف رہا۔ پھر وہ انٹاریو یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا اور اپنی تحقیق پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

یہ ۲۰ راکتوبر ۱۸۲۰ء کا دن تھا۔ اگلے دن فریڈرک کو لبلبے پر ایک تقریر کرنی تھی۔ وہ کافی دیر تک اس کی تیاری کرتا رہا اور کافی دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔ آخر کافی دیر کے بعد وہ اٹھا اور پھر سونے چلا گیا۔ سوتے ہوئے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیند میں ہی اپنے پاس پڑا لیمپ روشن کیا اور جلدی جلدی کاغذ پر یہ الفاظ لکھے:

''کتوں کے لبلبے سے آنے والی نالی باندھ دو۔ سات آٹھ ہفتے انتظار کرو۔ اس کے بعد لبلبہ باہر نکال کر اس کا مادہ حاصل کرو۔'' یہ الفاظ لکھ کر وہ پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس نے حیرانی سے اس تحریر کو دیکھا اور پھر اس پر غور کرنے لگا۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ لبلبے سے نکلی دوسری رطوبت جو کہ خوراک ہضم کرتی ہے وہ اس مواد کو ختم کر دیتی ہے جو ذیابیطس کو روکتا ہے۔ اگر اس رطوبت سے نجات

حاصل کرلی جائے اور پھر لبلبے کو نچوڑا جائے تو اس بیماری کو ختم کرنے والا مادہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

وہ اس پر غور کرتا رہا۔ بالآخر اس نے یہ تجربہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس نے دس کتوں کو بے ہوش کر کے ان کے لبلبے نکالے اور ان کو ٹکڑوں میں کاٹ کر ریت کے ساتھ پیس لیا اور اس مرکب کو نمک والے پانی میں ملا کر اسکو چھان لیا۔ پھر اس کو ٹیکے کی صورت میں کتوں کے جسم میں داخل کیا۔ نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ اس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے تجربے کو بار بار دہرایا اور ہر بار کامیابی حاصل کی۔ اس طرح فریڈرک کے اس خواب نے ذیابیطس کی بیماری کا علاج دریافت کرلیا جو سائنس کی دُنیا میں ایک انقلاب تھا۔

●●●

بچّوں کے امتحانات اور مسائل

امتحان کا خوف

شائستہ اعظمی

''بھاگو، بھاگو شیر آیا شیر آیا'' اگر یہ جملہ کسی سوئے ہوئے بچہ کو جگا کر کہا جائے تو وہ کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کرے گا۔ اس کے برخلاف اگر ان سے یہ کہا جائے۔ امتحان سر پر آگیا اور تم ابھی تک سو رہے ہو تو وہ بچہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے گا۔ آنکھیں پھاڑے، منھ کھولے کانپتے ہوئے ہکلانے لگے گا۔ یہ ''امتحان فوبیا'' بہت سے بچّوں کو شیر سے زیادہ خوفناک محسوس ہوتا ہے اور ایسا اس لئے ہے کیونکہ اکثر بچے امتحان کے اصل مقصد کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ان کی نظر میں امتحان سوال جواب کو رٹا مار کر امتحانی پرچہ لکھ کر اچھے نمبرات حاصل کرنا ہے۔ جبکہ امتحان ہماری صلاحیتوں کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہے۔ وقت کی پابندی، صلاحیتوں کا صحیح استعمال، سخت محنت، ہمت استقلال ان سب کا مجموعہ ہی ہمیں امتحان میں شاندار کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ امتحان کے لئے ایک چیز جو بہت ضروری ہے وہ ہے ایمانداری۔

ایمان داری سے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بچہ عمر محمود چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ رزلٹ تیار کرنے سے قبل کلاس ٹیچر نے بچوں کو جوابی پرچے تقسیم کئے اور کہا اپنے پرچے اچھی طرح جانچ لو۔ کہاں کہاں غلطی ہوئی ہے آئندہ یہ غلطی نہ دہرائی جائے۔ جب عمر محمود نے اپنے پرچے چیک کئے تو ایک پرچہ میں اسے ایک نمبر غلطی سے زیادہ مل گیا تھا۔ وہ فوراً ٹیچر کے پاس گیا اور کہا مس آپ نے ایک مارکس ایکسٹرا دے دیا ہیں۔ ٹیچر اس کی ایمانداری سے بہت خوش ہوئیں اور پرچہ پر 2+ لکھ کر دو نمبر اور بڑھا دیئے اور بچوں سے کہا اس کی ایمانداری کے لئے تالیاں بجائی جائیں۔

سال بھر کھیل کود، فضول مشغلوں میں مصروف ہو کر وقت گنوانے کے بعد آخری وقت میں امتحان کی تیاری نہ ہونے پر بچے نقل کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے پرچہ حل کرنے میں مدد کے لئے التجا کرتے ہیں۔ یا بغیر سوچے سمجھے جوابی پرچہ پر کچھ بھی لکھ کر آجاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ناکام ہو جاتے ہیں یا پھر جیسے تیسے پاس ہوتے ہیں۔ کوشش کریں کہ اپنی محنت سے پاس ہوں تاکہ ضمیر کی ملامت سے بچ سکیں۔ اور روحانی سکون حاصل کر سکیں۔

کچھ بچے غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں انہیں سب کچھ جلدی یاد ہو جاتا ہے۔ کچھ ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں لیکن وہ سخت محنت کر کے کامیاب ہوتے ہیں۔ سارے بچوں کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ شیکپئر اور آئن اسٹائن جو دنیا کی نامور ہستیوں میں شمار کئے جاتے ہیں انہیں اکثر امتحان میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے خود کو منوالیا۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کبھی یونیورسٹی ٹاپر نہیں رہے لیکن ان کے کارناموں کی گونج رہتی دنیا تک سنائی دے گی۔ اگر خدانخواستہ کبھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو تھک کر ہار مان کر بیٹھ نہ جائیں بلکہ ہمت اور حوصلے سے سخت محنت

کر کے امتحان کیلئے خود کو تیار کریں اور اپنا آپ منوائیں۔

بعض بچّوں کو اپنے والدین اور اساتذہ سے شکایت ہوتی ہے کہ وہ ان سے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے لئے نفسیاتی دباؤ ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں پڑھائی سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔ بچّوں کی باتیں کسی حد تک درست بھی ہیں۔ لیکن کیا انہیں یہ نہیں لگتا کہ جو اساتذہ انہیں محنت سے پڑھاتے ہیں اپنی تھکان کی پروا کئے بغیر اپنے طلبا کے شاندار مستقبل کے لئے فکر مند رہتے ہیں۔ اور وہ والدین جو اپنی محدود آمدنی سے بچا کر، اپنی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر انہیں اچھی کوچنگ مہیا کراتے ہیں۔ کیا انکی قربانیوں اور محبتوں کے بدلے آپ انہیں شاندار کامیابی کا تحفہ نہیں دے سکتے۔ کچھ بچّے تو ایسے ہیں جو باغیانہ تیور اختیار کرتے ہیں اور انتہائی خطرناک اقدام اٹھالیتے ہیں یا تو وہ گھر سے بھاگ جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ امتحان سے راہِ فرار اختیار کرنے کا یہ خطرناک طریقہ ان کی دُنیا اور آخرت دونوں خراب کر دیتا ہے۔

اگر امتحان کی تیاری بروقت اور خوب دل لگا کر کی جائے تو یہی امتحان تکلیف دہ ہونے کے بجائے پر لطف محسوس ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یکسوئی سے اپنے مقصد کے لئے سنجیدہ ہو جائیں۔ جو بچے وقت پر پڑھائی نہ کر کے امتحان کی تیاری ٹھیک طرح نہیں کر پاتے وہ امتحان کے وقت کافی پریشانیوں کا سامنا کرتے ہیں۔ نہ تو وہ ٹھیک طرح سے کھانا کھاتے ہیں۔ نہ رات کو بھرپور نیند سو پاتے ہیں اور پھر جب وہ تھکے تھکے امتحان گاہ پہنچتے ہیں تو آخری وقت میں جو کچھ پڑھا تھا وہ بھی بھول جاتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے دنیا ہمارے لئے امتحان گاہ بنائی ہے۔ جس میں ہمیں خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ امتحان دینا ہے۔ اپنے نفس پر قابو رکھ کر خشوع وخضوع کی عبادت، حرام اور حلال کا فرق، برائیوں سے بچ کر نیکی کے راستوں پر

چلنے کا امتحان نماز، روزوں اور تلاوت کے لئے اس طرح کی تیاری کریں جو اللہ کو پسند آئے۔

اگر ہم آخرت کے امتحان کے لئے خود کو اس طرح تیار کریں جس طرح ہمارے رب نے ہمیں حکم دیا ہے تو انشاء اللہ وہ ہم پر بے حساب انعام واکرام کی بارش کر دیں گے۔

•••

پڑھنے میں مشکل (دشواری)

ڈاکٹر محمد ارشد

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

پڑھائی میں مشکل ایک خاص علمی مشکل ہے جس میں بچّے پڑھنے لکھنے اور ہجے (تلفظ) کرنے میں مشکل کا سامنا کرتے ہیں حالانکہ بچّے کی ذہانت اچھی ہوتی ہے۔ بچہ کتاب یا رسالے میں لکھے ہوئے الفاظ پڑھنے میں مشکل کا سامنا کرتا ہے لیکن بچہ ذہنی طور پر ٹھیک ہوتا ہے۔ بچہ ذہن میں پڑھائی کرنے والے حصّے میں خرابی کی وجہ سے پڑھائی میں کامیاب نہیں ہوتا۔ بچہ تلفظ اور الفظ بولنے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ مستقل رہنے والی بیماری ہے اور کسی دوائی سے علاج ممکن نہیں ہے۔

اقسام

۱۔ سامعاتی (سماعت) الفاظ کی آواز میں مشکل۔

۲۔ بصری (بصارت) ۳۔ توجہ

وجوہات

۱۔ موروثی یا خاندانی (دماغ کا بائیں طرف کا حصہ)

۲۔ پیدائشی ۳۔ دماغی چوٹ

علامات

بچے پرائمری سکول سے الفاظ پڑھنے پہچاننے اور تلفظ کرنے میں مشکل کا سامنا کرتے ہیں۔ وہ اشکال، حروف تہجی اور الفاظ پڑھنے میں ہچکچاہٹ کا سامنا کرتے ہیں۔

بچے میں درج ذیل علامتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ بہت زیادہ تھکاوٹ۔ ۲۔ خوداعتمادی میں کمی۔

۳۔ سستی کاہلی اور بے احتیاطی۔ ۴۔ آسانی سے ناکامی کا سامنا۔

۵۔ آسانی سے بدحواس ہونا۔ ۶۔ تعلیمی کمزوری۔

۷۔ اسکول کے کام میں بے قاعدگی اور دشواری۔

۸۔ جماعت میں آرام سے نہ بیٹھنا

۹۔ سیکھنے کے لئے بار بار ہدایت سننا۔

۱۰۔ الفاظ کی بجائے تصوروں میں سوچنا۔

نفسیاتی

پریشانی، اداسی، اسکول انکاری، نیند کی خرابی، خوداعتمادی۔

مثبت خصوصیات

ذہین۔ سائنسدان۔ آرٹسٹ۔ موجد حساب اورفن تعمیر میں خداداد صلاحیت، یہ بچے خدا کی طرف سے غیر معمولی ذہانت اور صلاحیتوں کے ماہر ہوتے ہیں۔

بچے اورخاندان کی کہانی تفصیل سے سنیں۔نفسیاتی تجزیہ۔

استاد، والدین اور بزرگوں کا مشاہدہ سنیں۔جسمانی بیماریاں پتہ چلانا۔

علاج

پڑھنے میں دشواری کا کوئی مستقل علاج نہیں ہے اس لئے اس پر غیر ضروری پیسے، دمدرود اور دوائیں نہ خرچ کریں کیونکہ یہ دماغ کے ان حصّوں کو متاثر کرتی ہے جن کا تعلق الفاظ پڑھنے اور تلفظ سے ہے۔لیکن ان بچّوں کی ذہانت دوسرے بچّوں سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

درج ذیل طریقے اپنانے سے پڑھنے میں دشواری کی صورت میں مدد مل سکتی ہے۔جس کے لئے والدین اساتذہ خاندان میڈیا اور سیاستدانوں کو مل کر کام کرنا ہے۔

۱۔ بچے کے کان اور آنکھوں کا چیک اپ کروائیں۔

۲۔ بچے اور خاندان کو تفصیل سے اس بیماری کے متعلق بتائیں اور تسلّی دیں۔

۳۔ بچے کی پریشانی، اُداسی، اسکول انکاری اور نیند کے مسئلے کا علاج کریں۔

۴۔ نیند کے لئے بچے کو وقت پر سونے کے لئے بھیجیں۔سوڈے والے ڈرنگ نہ پیئیں۔چاکلیٹ سے پرہیز کریں۔روزانہ ورزش کریں۔

تازہ پھل وغیرہ لیں۔ اچھی کتابیں ٹیپ ریکارڈ پر سنیں۔ بچے کو کہانی

سنائیں۔

۵۔ بچے کے طرزِ عمل کا علاج (سستی کاہلی وغیرہ) کروائیں۔

۶۔ گفتگو یا بول چال کا علاج کروائیں۔

۷۔ گھر میں سکون اور دوستانہ ماحول بنائیں۔

۸۔ خاندان کے لوگ مل کر بچّے کی پڑھنے کی دشواری سمجھیں اور بچّے کی مدد کریں۔ بغیر تنقید، طنز ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے۔

۹۔ بچّے کے لئے پڑھائی میں مشکل دشواری کے خاتمے کے لئے خاص اساتذہ کا انتظام کریں۔

۱۰۔ بچّے کو باعدہ کھیلوں میں شرکت کروائیں۔

۱۱۔ بچّے کی خوداعتمادی کی تعریف اور انعام سے بڑھائیں۔

۱۲۔ اگر بچّے میں مرگی وغیرہ ہو تو اس کا علاج کروائیں۔

(علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ حدیث مبارک)

۱۳۔ بچّے کے مستقبل کے لئے مناسب پیشے کا انتخاب کریں۔

۱۴۔ اسپیشل کمپیوٹر پروگرام پر بچّے کو سکھائیں مثلاً Dore پروگرام۔

مرض کی پیشینگوئی

تقریباً 20 فی صد بچّے بالغ ہونے پر پڑھنے میں دشواری پر قابو پالیتے ہیں۔ اگر اس کی تشخیص جلدی کر لی جائے اور مناسب مدد دینے سے بچّے بہتر زندگی اور پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔

•••

کیسے کریں امتحان کی تیاری

محمد الیاس انجم

امتحانات کے آتے ہی بچّوں کے لئے مصیبت کھڑی ہوجاتی ہے۔ امتحانات کی وجہ سے بچّوں پر کئی طرح کا نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے۔ جواُن کو فکر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مگر اِس طرح نروس رہنے سے کیا فائدہ۔ بچّوں کو چاہئے کہ وہ اس خوف سے نکل کر پوری توجہ سے اپنی پڑھائی میں لگ جائیں۔ اُن کو چاہئے کہ اب تک جو وقت ضائع ہوگیا اُس کی تلافی تو ممکن نہیں ہے مگر آگے کی سوچیں۔ یہ سوچیں کہ کس مضمون میں کتنی تیاری کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر بچّے ششماہی امتحانات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اگر اس امتحان پر توجہ دی جائے تو تقریباً سارا کورس نظر میں آجاتا ہے۔ پھر اپنی خامیوں کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ دیر رات تک جاگنا بے سود ہے۔ جب زیادہ دباؤ میں کام ہوتا ہے تو کام بہتر نہیں ہوتا۔ اور اس کا صحت پر بھی اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ اکثر بچّے بیمار پڑ جاتے ہیں۔

والدین کیا کریں......؟ والدین میں اگر دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں تو بہت خوب مگر جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں، اُنہیں بچّوں کو دِلاسہ دینا چاہئے اور اُن کی ہمّت افزائی کرنی چاہئے۔ اکثر مائیں یہ کام بخوبی انجام دیتی ہیں۔ اگر بچّے پر

نیند کا غلبہ ہے تو چائے یا کافی بنا کر دیں تا کہ نیند زیادہ پریشان نہ کرے۔ پڑھائی سے پہلے ہلکی غذا لیں تا کہ نیند کا غلبہ نہ ہو۔ خاص کر تبدیلی موسم کی وجہ سے موسمی بیماریاں اکثر گھیر لیتی ہیں، ان کا علاج فوراً ہی کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں لاپرواہی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے

●●●

اپنی معلومات بڑھائیں

جیب والا جانور

میر بابر مشتاق

ممالیہ میں دودھ دینے والے جانور اور ایسے جانور شامل ہیں جو بچے دیتے ہیں لیکن آسٹریلیا، تسمانیہ اور نیوگنی میں ایسے ممالیہ بھی ملتے ہیں جو انڈے دیتے ہیں اور اپنے بچوں کو تھیلی یا جھولی میں پالتے ہیں۔ ایسے ممالیہ جانوروں میں سب سے معروف جانور کینگرو ہے۔

کینگرو کا نام کینگرو کیسے پڑا؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح کپتان جیمز کک (James Cook) نے مقامی لوگوں سے اس جانور کا نام دریافت کیا۔ ان لوگوں کی زبان میں اگر یہ کہنا ہو کہ ''میں نہیں جانتا'' تو اس کو کینگرو کہتے ہیں۔ جیمز کک یہ نام سمجھا اور اس وقت سے اس جانور کا نام کینگرو پڑ گیا۔

کینگرو کی کئی قسمیں ہیں زیادہ تر کینگرو زمین پر پھرتے ہیں لیکن بعض درختوں پر بھی رہتے ہیں۔ عام کینگرو جنگلی کہلاتا ہے اور قد و قامت میں سب سے

بڑا ہوتا ہے۔ یہ کینگر واعظم ہے، چوہے کی طرح کا کینگر وخرگوش جتنا بڑا ہوتا ہے لیکن شکل وصورت چوہے سے ملتی ہے، ایک زمانے میں مقامی لوگ کینگرو کا شکار کرتے اور اس کا گوشت کھاتے تھے۔ اس کی کھال کے بہت عمدہ دستانے اور جوتے بنتے ہیں۔ جنگلی کینگرو قد وقامت میں سات فٹ تک ہوتا ہے اور وزن تقریباً 200 پاؤنڈ۔ مادہ کینگرو چھوٹی ہوتی ہے۔ کینگرو کی یہ قسم نیو ساؤتھ ویلز اور کیونز لینڈ کے کھلے میدان اور خاردار پودوں کے جنگلات سے لے کر جنوب مغربی آسٹریلیا اور تسمانیہ میں پائی جاتی ہے۔

جنگلی کینگرو کی پچھلی ٹانگیں بہت لمبی اور مضبوط ہوتی ہے۔ انہیں ٹانگوں پر یہ کودتا پھرتا ہے۔ اس کی دم لنگر کا کام کرتی ہے اور چھلانگ لگانے میں بھی مدد دیتی ہے۔ عام رفتار میں ایک چھلانگ 5 سے 10 ف تک ہوتی ہے لیکن ضرورت پڑے تو دم کی مدد سے پچیس پچیس فٹ لمبی کلانچیں بھی بھر لیتا ہے اور جب بیٹھتا ہے تو پچھلی ٹانگوں کو دم کی تپائی سی بنا کر اس کے سہارے بیٹھ جاتا ہے۔ کینگرو زیادہ تر بڑے بڑے گروہوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں ایک گروہ میں ہزار تک جانور کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن اب تعداد کم ہوگئی ہے۔ گائے کی طرح زمین پر لیٹ کر سوتے ہیں۔ عام طور پر سبزی خور ہیں۔ عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پندرہ سال زندہ رہتے ہیں۔ قدرت نے اس کی پرورش کا بہت اچھا انتظام کیا ہے۔ کینگرو میں دوسری دلچسپ چیز یہ ہے کہ مادہ کینگرو بچوں کو چھ ماہ تک جھولی یا تھیلی میں پالتی ہے۔ یہاں وہ گرمی بھی پاتے ہیں اور خوراک بھی۔ جب ذرا بڑے ہوجاتے ہیں تو مزے سے تھیلی میں سے منہ نکال کر جھانکنا شروع کر دیتے ہیں اور جب مزید بڑے ہوجاتے ہیں تو اپنی تھیلی میں سے نکل کر خوب بھاگتے پھرتے ہیں لیکن جوں ہی کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں جھٹ سے پھر تھیلی میں گھس جاتے ہیں۔ بہت ہی تیز بھاگنا پڑے تو ماں بچوں کو

تھیلی سے نکال کر کہیں چھپا دیتی ہے اور بعد میں جب خطرہ ٹل جائے تو واپس آ کر تھیلی میں دوبارہ ڈال لیتی ہے۔

کینگرو دریا میں نہاتے ہیں۔ عام طور پر شریف اور ڈرپوک ہوتے ہیں لیکن تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اگر کوئی تنگ کرے تو اپنے پچھلے پاؤں کے پنجوں سے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ خاص طور پر بوڑھے نر تو کافی نڈر ہوتے ہیں۔ کینگرو اعظم کی تین اقسام ہیں۔ سلیٹی رنگ کا جنگلی کینگرو کیونز لینڈ اور جنوب مغربی آسٹریلیا میں ملتا ہے۔ دوسری قسم کا تسمانیہ کا کینگرو کہتے ہیں۔ یہ سرخ مائل بھورا ہوتا ہے۔ اور بال لمبے لیکن کھردرے ہوتے ہیں۔ تیسری قسم سرخ کینگرو آسٹریلیا کے میدانی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ گہرے رنگوں اور مضبوط جسامت والا کینگرو ہے۔ نر کا رنگ سرخی مائل ہوتا ہے۔ اس کا ایک قریبی رشتہ دار چٹانی کینگرو ہے۔ جو کافی بڑا اور طاقتور ہوتا ہے۔ اور ساحلی علاقوں کے علاوہ آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔ درخت پر رہنے والے کینگرو کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں جس سے یہ چھلانگیں لگا سکتا ہے۔ لیکن اب نسبتاً چھوٹی اور چپٹی ہو گئی ہیں۔ اس کے پاؤں کے موٹے تلوے بھی کھردرے ہو گئے ہیں تا کہ درخت پر چڑھنے میں مدد دے سکیں لمبائی چار پانچ فٹ تک ہوتی ہے لیکن اس کا آدھا حصہ دم ہوتی ہے۔ دم گھنے برش جیسی ہوتی ہے اور اچھلتے ہوئے توازن قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ کینگرو دن میں درختوں پر سوتے ہیں۔ رات کے وقت نیچے اترتے ہیں اور پانی پینے چلے جاتے ہیں۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے اس کا شکار آسٹریلوی کتے ''ڈینگو'' کی مدد سے کرتے ہیں اور اس کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

مشکی کینگرو قد و قامت میں سب سے چھوٹا کینگرو ہے۔ یہ صرف ڈیڑھ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ سرخی مائل بھوری کھال اور سبک جسم کی وجہ سے یہ کینگروؤں میں

خوبصورت ترین ہے۔ اس میں مشک کی طرح خوشبو آتی ہے۔لہٰذا اس نام سے مشہور ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے کھاتا ہے اس کے علاوہ پھل اور ہاتھوں میں پھل لے کر اس سلیقے سے کھاتا ہے۔ جیسے کوئی انسان کھا رہا ہو۔

چونکہ ہندوستان میں کینگرو نہیں ہوتے اس لئے آپ ان کو صرف چڑیا گھر میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔ باقی دنیا میں بھی صرف آسٹریلیا، تسمانیہ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ کینگرو کے علاوہ اور بہت سے جانور ہیں، جو ان علاقوں کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتے اور انڈے دیتے اور تھیلی یا جھولی میں بچّے پالنے کی وجہ سے دلچسپی کا باعث ہیں۔ دراصل انڈے دینے والے ممالیا کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی ممالیا اور پرندے ڈائنوسار سے وجود میں آئے۔ جو ان کی طرح انڈے دیتے تھے۔ آج سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے آسٹریلیا اور باقی ملحقہ علاقے ہماری زمین کے ساتھ مسلسل ٹکڑے کی شکل میں تھے۔ پھر زمینی تغیرات کے باعث علیحدہ ہو گئے اور ایک بڑا سا جزیرہ وجود میں آ گیا۔ چونکہ یہاں درندے نہیں تھے لہٰذا یہ جھولی بردار اور انڈے دینے والے ممالیا باقی رہ گئے، جو باقی براعظم سے غائب ہو گئے۔ یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بھیڑ، بکری، گائے، کتا، جو آج آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں یہ سب کچھ انسان ہی نے وہاں پہنچایا ہے۔

●●●

اپنی معلومات بڑھائیں

☆ زندگی صرف چند دنوں کے لئے ہوتی ہے اور اچھا کام ہمیشہ کے لئے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ کامیابی ایک ایسی سیڑھی ہے، جس پر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نہیں چڑھا جاسکتا۔ (امریکی کہاوت)

☆ ذہن ایک پیراشوٹ کی طرح ہوتا ہے پہلے اسے کھولیں پھر وہ کام کرے گا۔ (روسی کہاوت)

☆ کسی کی خوشیوں میں شریک ہونے سے اس کی خوشیاں دوگنی ہو جاتی ہیں اور دکھوں میں شریک ہونے سے دکھ آدھے رہ جاتے ہیں۔ (سوئزرلینڈ کی کہاوت)

•••

قرآن

قرآن: ایک حکمت بھری کتاب ہے۔

قرآن: حسن و باطل کے امتیاز کے لئے اتارا گیا۔

قرآن: تمام جہانوں کے لئے واحد دستور العمل ہے۔
قرآن: ہر قسم کے برکات وفیوض کا سرچشمہ ہے۔
قرآن: حق وسعادت کا مرقع ہے۔
قرآن: ایک فیصلہ کن قوت ہے۔
قرآن: جملہ انسانی ضروریات کے مسائل بیان کرتا ہے۔
قرآن: کی تصدیق پچھلی الہامی کتابیں کرتی ہیں۔
قرآن: میں شفا اور رحمت کے دریا بہتے ہیں۔
قرآن: رب کائنات وخالق جہاں کا کلام ہے۔

●●●

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

☆ کسی کے دل میں ایمان اور حسد اکٹھے جمع نہیں رہ سکتے۔
☆ درختوں کے پھل مت بیچا کرو جب تک کہ ان کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔
☆ تین دن سے زیادہ کسی آشنا سے ترک نہ کرو۔
☆ ایسا اشارہ بھی حرام ہے جس سے کسی کو رنج ہو جائے۔

●●●

☆ آدم کو سری لنکا میں اتارا اور آدم نے سب سے پہلے الحمد اللہ کہا۔
☆ آدمؑ سے پہلے زمین پر جنات رہتے تھے۔
☆ آدمؑ کا قد نوے فٹ تھا۔

☆ آدمؑ کا لقب صفی اللہ تھا۔

☆ جنت میں تنہائی کے احساس کی بناپر آدمؑ نے باری تعالیٰ کے حضور میں ایک جیون ساتھی کی خواہش کی، اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی اس خواہش کو پورے کرنے کیلئے حضرت حواؑ کو پیدا کیا۔

☆ جب حواؑ کو پیدا کیا گیا تو اس وقت آدمؑ نیند کی حالت میں تھے۔

☆ توبہ قبول ہونے سے پہلے آدمؑ نے تین روزے رکھے تھے جنہیں ایام فیض کہتے ہیں اور یہ روزے حضرت موسیٰؑ تک فرض رہے۔

☆ قرآن میں آدمؑ کا نام ۲۵ مقامات پر آیا ہے۔

☆ سچ بولنا نیکی کا راستہ ہے اور نیکی جنت تک لے جاتی ہے۔

☆ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جس کو محبت کرنے والے نصیب ہوتے ہیں۔

☆ خوش کلامی بھی صدقہ ہے۔

☆ ہر مشکل انسان کا امتحان لیتی ہے۔

●●●

دُنیا میں سب سے زیادہ

☆ گیہوں، کناڈا میں پیدا ہوتا ہے۔

☆ دودھ۔ ڈنمارک میں نکالا جاتا ہے۔

☆ چینی۔ کیوبا (امریکہ) میں تیار کی جاتی ہے۔

☆ ربر۔ جزائر شرق الہند میں

☆ چائے لنکا میں

☆ چاول برما میں

☆ گھڑیاں۔ سوئزرلینڈ میں

☆ اُون۔ آسٹریلیا میں

●●●

حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں جن پہاڑوں کے پتھروں کا استعمال کیا تھا ان کے نام یہ ہیں۔

طور سے طورسینا، جبل زیتون، جبل جودی، جبل حرا جو مکہ میں واقع ہے اس سے بنیاد بنائی گئی تھی اور باقی پہاڑوں کے پتھروں سے دیواریں اٹھائی گئی تھیں۔

●●●

ہندوستان کے مسلم حکمراں

نام		دورِ حکومت
بابر	:	۴؍سال
جلال الدین محمد اکبر	:	۴۹؍سال
بہادر شاہ ظفر	:	۲۰؍سال
احمد شاہ ابدالی	:	۹؍سال
محمد تغلق	:	۲۶؍سال
علاء الدین خلجی	:	۲۰؍سال
محمد غوری	:	۳۰؍سال
رضیہ سلطانہ	:	۴؍سال
جلال الدین خلجی	:	۶؍سال

- غیاث الدین تغلق	:	۵/سال
ابراہیم لودھی	:	۹/سال
جہانگیر	:	۲۲سال
اورنگ زیب	:	۴۹سال
بہادر شاہ ظفر	:	۵/سال
ہمایوں	:	۱۱/سال
محمد غزنوی	:	۳۳/سال
ناصر الدین	:	۲۰/سال

☆ سب سے پہلے خطرناک زلزلہ چین میں ۲۲/مئی ۱۹۶۰ء میں آیا تھا۔

☆ جوان آدمی ایک منٹ میں ۱۵۱ سے ۱۵۸ بار سانس لیتا اور چھوڑتا ہے۔

☆ سری لنکا کے لوگ مگرمچھ کے دانت کی پوجا کرتے ہیں۔

☆ تاج محل ۷/نومبر ۱۶۴۵ء کو بن کر تیار ہوا تھا۔

☆ ۲۱/جون کو سب سے بڑا دن ہوتا ہے۔ اور ۲۲/دسمبر کو سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے۔

☆ دُنیا میں سب سے بڑا گھنٹہ ماسکو میں ہے۔

☆ چین نے ہندوستان پر ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو حملہ کیا۔

☆ بھالو گھائل ہونے پر آدمی کی طرح روتا ہے۔

☆ جنوبی امریکہ میں دودھ کا درخت پایا جاتا ہے۔

●●●

حضرت محمد صلی اللہ وسلم کے والد محترم کا نام ہے۔ (حضرت عبداللہ)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا نام ہے۔ (بی بی آمنہؓ)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیوی کا نام ہے۔ (بی بی عائشہؓ)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی بیٹی کا نام ہے۔

(بی بی فاطمہؓ)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور داماد کا نام ہے۔

(حضرت علیؓ)

●●●

وہ کون سے نبیؑ ہیں جو ابوالبشر کہلاتے ہیں؟ (حضرت آدمؑ)

وہ کون سے نبی ہیں جن کو بادشاہِ وقت نے آگ میں ڈالا تھا۔ (حضرت ابراہیمؑ)

ان نبی کا نام کیا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا؟ (حضرت یونسؑ)

کس نبی کو اُن کے بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا؟ (حضرت یوسفؑ)

کون سے نبی حکمِ الٰہی سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے؟ (حضرت عیسیٰؑ)

●●●

حضرت محمد ﷺ کے پہلے بیٹے کا نام کیا تھا؟ (حضرت قاسمؓ)

حضرت محمد ﷺ کے دوسرے بیٹے کا نام کیا تھا؟ (حضرت عبداللہؓ)

حضرت محمد ﷺ کی پہلی صاحبزادی کا نام کیا تھا؟ (حضرت زینبؓ)

حضرت محمد ﷺ کی دوسری صاحبزادی کا نام کیا تھا؟ (حضرت رقیہؓ)

حضرت ﷺ کی تیسری صاحبزادی کا نام کیا تھا؟ (حضرت ام کلثومؓ)

حضرت ﷺ کی چوتھی صاحبزادی کا نام کیا تھا؟ (حضرت سید فاطمہؓ)

●●●

اسلام کے پہلے خلیفہ کون سے ہیں؟ (حضرت ابوبکرؓ)
اسلام کے دوسرے خلیفہ کون سے ہیں؟ (حضرت عمرؓ)
اسلام کے تیسرے خلیفہ کون سے ہیں؟ (حضرت عثمانؓ)
اسلام کے چوتھے خلیفہ کا کیا نام ہے؟ (حضرت علیؓ)

●●●

اللہ کے رسولوں پر کون وحی لے کے آتے تھے؟ (حضرت جبرئیلؑ)
کون بندوں کو رزق تقسیم کیا کرتے ہیں؟ (حضرت میکائیلؑ)
روح قبض کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ (حضرت عزرائیلؑ)
قیامت کے دن صور کون پھونکیں گے؟ (حضرت اسرافیلؑ)

●●●

امام اعظم کس کو کہا جاتا ہے؟ (حضرت امام ابوحنیفہؒ)
کس امام کے ماننے والوں کو "حنبلی" کہتے ہیں؟ (حضرت احمد بن حنبلؒ)
کس امام کے مسائل پر عمل کرنے والے "شافعی" کہلاتے ہیں؟
(حضرت محمد بن ادریسؒ)
کس کی تقلید کرنے والی کو "مالکی" کہا جاتا ہے؟ (حضرت امام مالکؒ)

اقوالِ زرّیں

بہترین دُعا

یا اللہ!

جوتو نے دیا، اور جوتو نے نہیں دیا
اور جوتو نے دے کر لے لیا
اُن سب پر تیرا شکر!
کیونکہ جوتو نے دیا وہ ''نعمت''
جوتو نے نہ دیا وہ تیری ''حکمت''
اور جوتو نے دے کر لے لیا وہ ''میرا امتحان''

یا اللہ!

ہم سب کو ہر حال میں شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ (آمین)

●●●

تین باتیں

ایک آدمی نے ایک کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں اُس نے صرف تین باتیں نوٹ کیں۔

۱۔ اللہ کا حکم مانو یا پھر اُس کی کائنات چھوڑ دو۔
۲۔ جھوٹ وہاں بولو جہاں اللہ نہ ہو یا پھر جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔
۳۔ اللہ کی عبادت کر دیا پھر اس کا دیا ہوا رزق کھانا چھوڑ دو۔

●●●

قسمت اور محنت میں فرق

''قسمت'' اور ''محنت'' میں فرق بہت آسان ہے۔

قسمت ایسی لفٹ کی طرح ہے جو لائٹ بند ہونے سے یا پھر کسی رُکاوٹ کی وجہ سے راستے میں ٹھہر سکتی ہے جب کہ محنت سیڑھیوں کی طرح ہے جن پر Step by Step چڑھنے سے انسان ایک نہ ایک دن ضرور اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

☆ دانا وہ ہے، جو کم بولے اور زیادہ سنے۔ (حضرت داؤدؑ)

☆ نعمتیں اُن کو ملتی ہیں جو نعمتوں کی قدر کرتے ہیں۔ (حکیم محمد سعید)

☆ صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو، ہر کام آسان ہونے سے پہلے مشکل ہوتا ہے۔ (شیخ سعدیؒ)

☆ بولنا کوئی بُری بات نہیں بلکہ اصل بات سچ بولنا ہے۔ (شیکسپیئر)

☆ خلق چار چیزوں میں ہے۔ سخاوت، الفت، نصیحت اور شفقت۔ (حضرت جنید بغدادیؒ)

●●●

☆ ''میں تمہیں بتاؤں کہ مسلم کون ہے، مسلم وہ ہے جس کی زبان وہاتھ

سے لوگ محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی زبان و ہاتھ سے لوگوں کے جان و مال کو خطرہ لاحق نہ ہو اور دراصل میں مہاجر وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں سے کنارہ کشی کرے اور مجاہد وہ ہے جو اطاعت الٰہی کی راہ میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔" (خطبہ حجتہ الوداع، ص: ۲۲۸)

●●●

☆ خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔
☆ ایک ساعت انصاف برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ (حضور اکرمؐ)
☆ جو اللہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے، اللہ اُس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
☆ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے خواہ منافق سے ملے، لے لو۔ (حضرت علیؓ)
☆ کم بولنا حکمت، کم کھانا صحت اور کم سونا عبادت ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

●●●

☆ اگر روزی عقل سے حاصل کی جاتی تو سارے بیوقوف بھوکے مرجاتے۔
☆ حق بات کہو چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔
☆ دل ایک آئینہ ہے۔ اگر صاف ہو تو خدا بھی دکھائی دیتا ہے۔
☆ ہر کام سے پہلے اس کا انجام سوچو۔
☆ دوسروں کو آئینہ دکھانے سے پہلے خود اپنا چہرہ دیکھ لو۔

●●●

☆ وقت ضائع مت کرو۔ آپ کا وقت آپ کی زندگی ہے۔

☆ زندگی محدود ہوتی ہے، وقت قیمتی ہوتا ہے۔
☆ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا جو اپنا وقت بے عملی میں کھو دیتے ہیں وہ اپنی ہر بات رسوائی کے ساتھ کھو بیٹھتے ہیں۔
☆ جو لوگ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں وہ ہمیشہ وقت کی کمی کا بہانہ بناتے ہیں۔
☆ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔
☆ وقت کی اہمیت جو نہیں جانتا وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔

●●●

☆ لینا چاہتے ہو تو والدین کی دعا لو۔
☆ دینا چاہتے ہو تو راہِ خدا میں دو۔
☆ لڑنا چاہتے ہو تو اسلام کی خاطر لڑو۔
☆ بیٹھنا چاہتے ہو تو اچھوں کے ساتھ بیٹھو۔
☆ رونا چاہتے ہو تو اپنے اعمال پر رو۔

●●●

☆ جس محفل میں اللہ کا ذکر سنو، وہاں بیٹھ کر سنو، ہو سکتا ہے کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔
☆ دُنیا کے قلیل مال پر قناعت کرو۔
☆ اپنے مقدر میں لکھے رزق پر فارغ رہو۔
☆ اس علم سے بچو جس میں عمل نہ ہو اور اس عمل سے بچو جس میں علم نہ ہو۔
☆ اصلاح نفس کی ہمہ وقت کوشش کرتے رہو ہوتا کہ تمہارے اندر اچھی

صفات پیدا ہوں۔

☆ اپنے ذہن کو بدگمانیوں سے پاک رکھو۔ ورنہ تم بھری دنیا میں کوئی بھی دوست اور غم گسار نہ پاؤ گے۔

☆ ہر شخص کا مقام اس کی دانشمندی اور ہنر مندی پر ہوتا ہے۔

☆ بے عقل آدمی اپنی کم علمی پر ہی مغرور ہوتا ہے۔

☆ کم کھاؤ اور زیادہ علم سیکھو اور عقلمندوں کی صحبت اختیار کرو۔

☆ کسی کو نصیحت کرنے سے پہلے خود نصیحت پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

☆ جب انسان محبت یا قرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو فائدہ کسی اور کو ہوتا ہے۔

☆ سچائی ایک ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی اور تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔

☆ دوسرے کے احساسات اور جذبات کا احترام کرو یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا تعلق شامل نہ ہو۔

☆ نعمت کا ملنا آزمائش ہے کہ تم شکر کرتے ہو یا ناشکری۔

☆ ملعون ہے وہ شخص جس کا اعتماد اپنے جیسی مخلوق پر ہے۔

☆ عظیم گناہوں کا کفارہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا ہے۔

☆ جو خود کو حقیر جانتا ہو وہ ہی عظیم ہے۔

☆ کامیاب انسان بننے کے لئے ہمیشہ وقت کی دہلیز کو پار کرنا پڑتا ہے۔

☆ خیرات کر کے احسان نہ جتاؤ۔

☆ اپنے دوست کو پیار دو، مگر راز نہ دو۔

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆ انسانوں کے ارمانوں کی حد قبر میں جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

☆ معافی سے بڑھ کر کوئی انتقام نہیں ہے۔
☆ جھوٹی تعریف لوگوں کو مغرور بنا دیتی ہے۔
☆ جب تین شخص سفر کو جائیں تو ایک کو اپنا سردار بنالیں۔
☆ زندگی بغیر محنت کے مصیبت اور بغیر عقل کے حیوانیت ہے۔
☆ تقدیر ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔
☆ وقت ایسا لمحہ ہے کہ انسان کو بنا بھی سکتا ہے اور گنوا بھی سکتا ہے۔
☆ وقت کو ٹھوکر مارنیوالے ہمیشہ دوسروں کی ٹھوکروں کا نشانہ بنتے ہیں۔
☆ یہ قت اتنی قیمتی شئے ہے کہ اسے کسی بھی دولت کے بدلے نہیں خریدا جاسکتا۔

●●●

☆ چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔
☆ مومن مومن کا آئینہ ہے۔
☆ خدمت انسان کا بہترین شغل ہے۔
☆ ہر نشے والی چیز سے پرہیز کرو۔
☆ دعا، بلا کو رفع کرتی ہے۔
☆ جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔
☆ دین غم خواری کا نام ہے۔
☆ سلام کو پھیلاؤ سلامتی رہے گی۔
☆ قبر کا عذاب برحق ہے۔
☆ حج کرنا بہترین جہاد ہے۔
☆ نکاح کا اعلان کیا کرو۔

☆ تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں۔ لالچ، حسد اور غم۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن حسد و لالچ ہے۔

☆ اگر دُنیا میں فلاح پانی ہے تو والدین کی خدمت کرو۔ دُنیا میں اُن لوگوں کی عزت ہوتی ہے جو اساتذہ کی عزت کرتے ہیں۔

☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے اللہ کی رحمت برستی ہے۔ آدمی مطالعہ سے بیدار ہوتا ہے، مکالمے سے اس میں تمیز آتی ہے۔ اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔

☆ جب انسان اپنے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو اُس وقت پانچ باتیں کہتا ہے۔ میں فانی مال تھا، تم نے مجھے بقا دے دی، میں تیرا دشمن تھا لیکن تم نے اب مجھے دوست بنالیا ہے۔ آج سے پہلے تو میری حفاظت کرتا تھا لیکن آج سے میں تیری حفاظت کروں گا۔ میں حقیر تھا اور تو نے مجھے عظیم بنادیا ہے، پہلے میں تیرے ہاتھ میں تھا اور اب میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں۔

☆ اُس شخص کو برا سمجھو جس کا کوئی دوست نہیں اور اسے اُس سے بھی زیادہ برا سمجھو جسے ایک دوست ملا اور اُس نے اُسے کھودیا۔ بہترین دوست وہ ہوتا ہے۔ جو خوشی کے لمحات کے ساتھ ساتھ دکھ کے لمحوں میں بھی آپ کا بھر پور ساتھ دے۔ جو شخص اپنے دوست کو پوشیدہ طور پر نصیحت کرے وہ اس کا محسن ہے۔ جب تک تم دل کو پریشان نہیں کروگے اُس وقت تک تم دوسروں کی پریشانیوں کو دور نہیں کر سکتے اگر کسی کو تمہارے بارے میں گمان نہیں تو اسے اچھا بن کر دکھاؤ۔ نرم اور صلح کن الفاظ بے حد طاقتور ہوتے ہیں۔

☆ جس سے تمہیں سچی محبت ہو اُس کے کسی معاملے میں مقابلہ مت کرو، کسی کی خامی کا مذاق مت اُڑاؤ جس کو دور کرنا اُس کی پہنچ میں نہ ہو۔

☆ کسی بھی انسان سے ملو تو پرُخلوص انداز سے ملو کہ تمہاری یاد مدتوں اس کے دل میں رہے۔

☆ سچائی کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا کیونکہ سچے انسان کا مرتبہ اعلیٰ ہوتا ہے۔
☆ وعدہ کرو تو اسے پورا کرو کیونکہ قیامت کے دن اللہ وعدے کے بارے میں پوچھے گا۔

•••

☆ دوسروں کی عزت کرو گے تو ہر کوئی تمہاری عزت اور احترام کرے گا۔
☆ اللہ کی عبادت کرنا، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا بہترین زندگی بسر کرنے کا راز اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہے۔
☆ اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کی خوشی برباد مت کرو، تقدیر کے فیصلے سے ہر انسان ہار جاتا ہے۔
☆ نادان کی زبان اس کی مالک ہوتی ہے اور عقل منداپنی زبان کا خود مالک ہوتا ہے جس طرح خاموش پانی کی گہرائی زیادہ ہوتی ہے اسی طرح خاموش انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔
☆ رزق کی کمی اور زیادتی دونوں ہی برائی کی طرف لے جاتی ہیں۔
☆ دنیا داری نام ہے اللہ سے غافل ہو جانے کا ،ضروریات زندگی اور بال بچوں کی پرورش کرنا دنیا داری نہیں ہے۔
☆ مصیبت کو پوشیدہ رکھنا جوانمردی ہے۔
☆ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔
☆ اچھی عادات کی مالکہ نیک اور پارسا عورت اگر فقیر کے گھر میں بھی ہو تو اسے بھی بادشاہ بنا دیتی ہے۔
☆ دوست وہ ہے جو دوست کا ہاتھ پریشان حالی و تنگی میں پکڑتا ہے۔
☆ بروں کے ساتھ نیکی کرنا ایسا ہی ہے جیسا نیکوں کے ساتھ برائی کرنا۔

☆ بھوک اور مسکینی میں زندگی گزارنا کسی کمینے کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے۔

☆ جو کوئی اپنی کمائی سے روٹی کھاتا ہے اسے حاطم طائی کا احسان اٹھانا نہیں پڑتا۔

☆ شیر سے پنجہ آزمائی کرنا اور تلوار پر مکہ مارنا عقلمندوں کا کام نہیں ہے۔

●●●

قہقہوں کی محفل

دعوت

ایک کنجوس آدمی کبھی کسی کی دعوت نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کا نوکر بازار سے گزر رہا تھا کہ کنجوس آدمی کا دوست اسے ملا اور کہا: ’’کیوں بھئی تمہارا مالک ہماری دعوت کب کرے گا؟‘‘

’’جناب اب تو روز محشر ہی ہمارا مالک دعوت کرے گا۔‘‘ نوکر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

دوست نے ساری بات کنجوس کو بتا دی۔ کنجوس نے نوکر کو بلایا اور پوچھا:
’’کیوں بھئی تمہیں کس نے کہا ہے کہ دعوت کا دن مقرر کرو۔‘‘

•••

دو پاگل

دو پاگل آموں کے باغ سے گزر رہے تھے کہ اچانک انہیں خیال آیا کہ کاش وہ آم ہوتے! یہ سوچتے ہی وہ درخت پر چڑھ گئے اور الٹے لٹک گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک پاگل زمین پر گر گیا تو لٹکا ہوا پاگل بولا: کیوں تھک گئے؟''

دوسرا پاگل فوراً بولا: نہیں میں پک گیا ہوں۔''

●●●

جواب

نانی (سامیہ سے) ''بتاؤ اگر سو میں سے گیارہ گھٹا دیں تو کیا بچے گا؟''

سامیہ: ''نانی اماں میں بچوں گی۔''

نانی: '' کیسے؟''

سامیہ: ''میں نواسی ہوں نا''۔

●●●

آرام سے

دکاندار پیراشوٹ بیچ رہا تھا۔ جہاز سے چھلانگ لگاؤ، بٹن دباؤ اور نیچے آرام سے اتر جاؤ۔

گاہک: اگر پیراشوٹ نہیں کھلا تو؟

دکاندار: ''او اللہ کے بندے کیا مسئلہ واپس کر دینا''

●●●

☆ ایک مرتبہ مولانا حالی سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے پاس ٹھہرے جو بڑے زمیندار بھی تھے۔ گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آ گیا۔
رئیس صاحب نے اس سے کہا کہ "یہ بزرگ جو آرام کر رہے ہیں ان کو پنکھا جھل دے۔
وہ بیچارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چپکے سے رئیس صاحب سے کہا یہ بزرگ جو کہ آرام کر رہے ہیں، کون ہیں؟
میں نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔
رئیس نے جواب دیا: کم بخت، تو ان کو نہیں جانتا، حالانکہ سارے ہندوستان میں انکا شہرہ ہے۔ یہ مولوی حالؔی ہیں۔"
اس پر غریب کسان نے بڑے تعجب سے کہا...... "جی کبھی ہالی بھی مولوی ہوئے ہیں......؟"
وہ کسان حالؔی کو ہالی سمجھا جسکے معنی ہل چلانے والے کے ہیں۔

●●●

☆ ایک آدمی جنگل کے راستے اپنے گھر جا رہا تھا کہ تبھی اس کے پیر میں ایک کانٹا لگ گیا۔ کانٹا لگتے ہی وہ آدمی درد سے چیخ پڑا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خوش ہوا اور بولا...... اچھا ہوا آج میں اپنے جوتے گھر ہی چھوڑ آیا۔

●●●

☆ بس میں کنڈکٹر نے ایک مسافر سے کہا ٹکٹ دکھایئے۔
مسافر نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر دکھایا، جسے دیکھ کر کنڈکٹر بولا

..........یہ تو پرانا ٹکٹ ہے۔
مسافر نے برجستہ کہا......بس کون سی تمہاری نئی ہے۔

●●●

☆ کلاس روم میں استاد نے لڑکوں سے کرکٹ پر مضمون لکھنے کو کہا۔
کچھ دیر بعد ایک لڑکے کو خاموش بیٹھا دیکھ کر استاد نے قریب جاکر اس کی کاپی دیکھی تو اُس نے اپنی کاپی میں لکھا تھا، آج بارش ہونے کی وجہ سے میچ منسوخ کر دیا گیا۔

●●●

☆ مذہبی کتاب پڑھنے بیٹھی دادی کو دیکھ کر پوتے نے ماں سے پوچھا۔
پوتا: ماں......! دادی ماں کونسی سے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں......؟
ماں: اچھا وہ......فائنل اگزام کی تیاری کر رہی ہیں بیٹے۔

●●●

☆ ٹیچر بچے سے: تمہاری پتاجی کیا کام کرتے ہیں؟
راجو: آئی۔سی۔ایس۔اِن سمرپی۔سی۔ایس اِن وِنٹر......
ٹیچر: اس کا کیا مطلب......؟
راجو: آئیس کریم سیلر اِن ستمبر۔پکوڑا چاٹ سیلر اِن وِنٹر۔

●●●
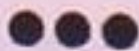
☆ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پاس عربی کی ایک کتاب تھی۔ دہلی کے ایک مولوی صاحب اس کتاب کو دیکھنے کے شائق تھے۔ تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ ڈپٹی صاحب نہ انکار کر سکتے، نہ دینا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب کے اِصرار پر آخر ایک دن اُنہیں کتاب دینی پڑی۔
کتاب مولوی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈپٹی صاحب نے فرمایا:
"کتاب تو بڑی اچھی ہے، لیکن اس کی جلد سور کے چمڑے کی ہے۔"
مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنتے تو لاحول پڑھتے ہوئے فوراً پیچھے ہٹ گئے اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔

●●●

☆ ایک اَن پڑھ گنوار ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پڑھانے کے لئے اسکول بھیجا۔
ایک دن اسکول سے آنے کے بعد لڑکی نے اپنے ابو سے کہا
ابو: آج اسکول میں ہماری پٹائی لگی۔
ابو نے حیرت سے پوچھا۔ بیٹا کیوں؟
لڑکی۔ نہیں ابا، ہم آج لیٹ گئے تھے۔ پاس ہی بیٹھی لڑکی کی ماں نے غصے سے کہا... ہم تجھے اسکول پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں یا لیٹنے کے لئے؟

●●●

☆ ٹیچر: بی۔ اے ختم ہوا۔ اب آگے کیا کرو گی کملا؟
کملا: ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی کروں گی۔
ٹیچر: یہ ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی کیا ہے؟
کملا: اسٹاپ اسٹڈیز لرن ککنگ کروں گی۔

☆ سہیل سارا وقت ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا بیٹھا گزار دیتا۔ نہ وہ باہر کہیں کوئی کام کرتا ہے اور نہ ہی گھر کا۔ ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔
آج دوپہر میں کھانے کے لئے کیا چیز ہے؟
بیوی غصے سے آگ بگولہ ہوگئی، اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
جاؤ۔ آج خود کھانا پکاؤ اور یہ سمجھو کے میں شہر سے باہر گئی ہوں۔ اس کے بعد وہ ریموٹ لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔
تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب خود اُسے بھوک لگی تو باورچی خانہ میں گئی جہاں اُس نے دیکھا کہ سارے برتن خالی پڑے ہیں اور سہیل ایک کمرے میں محوِ خواب ہے۔
بیوی نے سہیل کو جگایا اور پوچھا۔
تم نے کھانا کھایا؟
ہاں......اُس نے جواب دیا۔
میرے لئے کچھ نہیں پکایا؟ بیوی نے پوچھا
میں نے سوچا کہ تم شہر سے باہر گئی ہوئی ہو۔
سہیل نے جواب دیا اور پھر سو گیا۔

●●●

☆ ایک دن عامر کے باپ نے اس کو غصے میں ڈانتے ہوئے بولا۔
تم نے میرا نام مٹی میں ملا دیا ہے۔
عامر تھا تھوڑا سا بیوقوف......اس نے اپنے باپ کے منہ سے جب یہ بات سنی تو اس نے کدال لے کر مٹی کھودنا شروع کر دیا۔ اس کے باپ نے پوچھا

مٹی کیوں کھود رہے ہو؟

تب اس نے جواب دیا کہ آپ کا نام تلاش رہا ہوں۔

●●●

☆ ایک بار ایک گاڑی میں بہت سی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں کہ اتنے میں ایک بوڑھا آیا۔ بوڑھے نے اُدھر دیکھا مگر کوئی سیٹ خالی نہ پائی۔ اب اس کی نظر ڈرائیور کی سیٹ پر پڑی تو وہ بیٹھ گیا۔

کسی نے پیچھے سے کہا...... چاچا...... یہ ڈرائیور کی سیٹ ہے۔

بوڑھا بولا کوئی بات نہیں وہ دوسری گاڑی میں آئے گا۔

●●●

☆ ایک شاعر کا تخلص "لنگڑے" تھا۔ جس نے اپنی ایک غزل کے شعر میں لکھا۔

"تیرے پیار میں ہوگئے لنگڑے
اب قوت نہ رہی دو قدم چلنے کی"

●●●

برڈ فلو

☆ بیٹا: ماں میں آج سکول نہیں جاؤں گا۔

ماں! بیٹا کیوں؟

بیٹا: مجھے برڈ فلو ہو گیا ہے۔

ماں: برڈ فلو تو مرغوں کو ہوتا ہے آپ کو کیسے ہو گیا۔
بیٹا: ٹیچر سارا دن مجھے کلاس میں مرغا ہی بنائے رکھتی ہے۔

●●●

پٹری اور ریل گاڑی

☆ استاد اپنے طلبا سے مخاطب ہو کر آپ پٹری اور ریل گاڑی بناؤ میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔
پانچ منٹ بعد
استاد: ثاقب آپ نے پٹری تو بنائی ہے لیکن ریل گاڑی کہاں ہے؟
ثاقب: جناب آپ پانچ منٹ دیر سے پہنچے ہیں۔ ریل گاڑی چھوٹ گئی ہے۔

●●●

ہاتھ دھو کر

☆ ٹیچر (اپنے سٹوڈنٹ سے) حسن آج پھر سے آپ نے ہوم ورک (Homework) نہیں کیا آج آپ کو مار کھانی پڑے گی نکالو ہاتھ.........
حسن: سر آپ ذرا ٹھہریئے میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔
ٹیچر (غصے سے) وہ کیوں؟
حسن: سر آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ کچھ بھی کھانے سے پہلے ہاتھ اچھی طرح دھو لینے چاہیئے۔

تقریر

ونسٹن چرچل کے متعلق ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار بڑی جلدی میں ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ڈرائیور سے ریڈیو اسٹیشن پر چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"مجھے افسوس ہے جناب! اس وقت میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مسٹر چرچل کی تقریر شروع ہونے والی ہے اور میں کسی قیمت پر اس سے محروم رہنا پسند نہیں کروں گا۔" مسٹر چرچل یہ سن کر نہایت خوش ہوئے اور ایک پونڈ ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں دے دیا۔ ڈرائیور نے گھوم کر انہیں دیکھا اور نرم لہجے میں کہا کہ چلئے تو پھر آپ کو چھوڑ ہی آؤں۔ مسٹر چرچل اور ان کی تقریر کو ڈالیے جہنم میں۔"

●●●

ناکافی شہادت

جج (گواہ سے) کیا تم نے بندوق کی نالی سے گولی کو نکلتے دیکھا تھا؟"

جواب ملا: "نہیں صرف آواز سنی تھی۔"

جج: "ناکافی شہادت: بیٹھ جاؤ۔"

گواہ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے مڑا اور زور سے ہنس دیا۔

جج: "تمہیں توہین عدالت کے جرم میں سزا ہو گی۔"

گواہ: "کیا آپ نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟"

جج: "نہیں صرف آواز سنی تھی۔"

گواہ: "ناکافی شہادت مائی لارڈ۔"

بوریا بستر

ایک مرتبہ مولانا شوکت علی جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ دوران تقریر انہوں نے کہا: ”برطانوی وزیر اعظم کہتا ہے ہم یورپ سے ترکوں کو بوریا بستر سمیت نکال دیں گے لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکالتے وقت بوریا بستر یہیں رکھوالیں گے۔ کیونکہ یہ چیزیں ہماری ہیں۔“

•••

اُلّو

ایک صاحب نے گھر میں اُلو پال رکھا تھا۔ وہ بازار گیا تو ان کی بیوی نے کہا:

”سنئے ذرا بازار سے اُلو کے لئے کچھ لیتے آیئے گا۔“

وہ صاحب دکاندار کے پاس پہنچ کر بولے۔

”آپ کے پاس اُلو کے کھانے کے لئے کچھ ہوگا؟“

دکاندار: ”یہاں کھائیں گے یا گھر جا کر؟“

•••

غصہ

ایک فوجی کیپٹن نے جب اپنے فوجی کے پاس پڑا ہوا سگریٹ کا جلتا ہوا ٹوٹا دیکھا تو اس نے غصے سے فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”کیا یہ تمہارا ہے؟“

''نو سر! آپ پی سکتے ہیں۔ بلا تکلف!'' فوجی مسکرا کر بولا۔

●●●

شرم

مجسٹریٹ (ملزم سے) ''تمہیں شرم آنی چاہئے آٹھویں مرتبہ تم عدالت میں آئے ہو۔''

ملزم: ''شرم کی کیا بات ہے؟ آپ تو روزانہ آتے ہیں۔''

●●●

ختم شد

BAZM-E ATFAL

by

Mohd. Ilyas Anjum

ISBN: 978-93-83033-09-6

Pubished by

Azad Book Vision

EP-316 Moh Dalpatian Jammu

Ph. 9797352280, 8803600920